راہِ عمل

مولانا وحید الدّین خاں

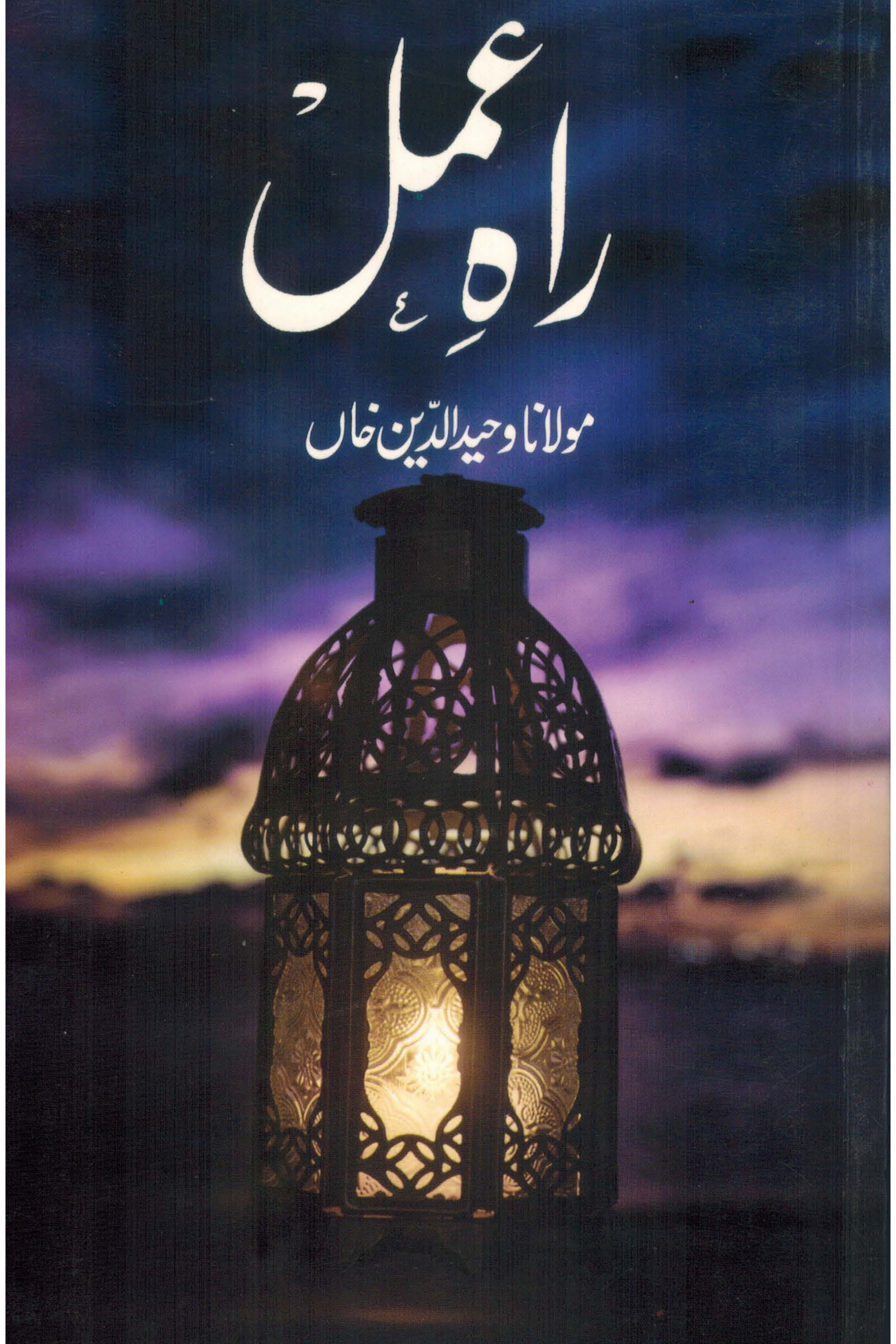

راہِ عمل

ماضی، حال اور مستقبل کا جائزہ

مولانا وحید الدین خاں

Rah-e-Amal

By Maulana Wahiduddin Khan

First Published 1990
Reprinted 2025

This book is copyright free and royalty free. It can be translated, reprinted, stored or used on any digital platform without prior permission from the author or the publisher. It can be used for commercial or non-profit purposes. However, kindly inform us about your publication and send us a sample copy of the printed material or link of the digital work.

e-mail: info@goodwordbooks.com
info@cpsglobal.org

Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
e-mail : info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301
Delhi NCR, India
e-mail: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Printed in India

فہرست

اتباعِ صراط، اتباعِ سُبل	5	سیاسی بدعت	47
اصول اور فروع	7	اجماعِ امت	48
جڑ اور شاخیں	8	ناقص استدلال	49
آفاقی حقیقت	9	نمونہ کا مسئلہ	53
ایک مثال	10	موجودہ زمانے کا تجربہ	55
دعوت کے بجائے تحفظ	12	ناکامی کا اعتراف	56
داخل کے بجائے خارج	13	نوآبادیاتی زمانہ	58
تبدیلی انسان کے بجائے تبدیلیِ حکومت	14	میدان عمل کا مسئلہ	59
کلیات کے بجائے جزئیات	16	جاپان کی مثال	60
سبب کے بجائے مرض	17	فوج سے زیادہ طاقت ور	61
راہ عمل	21	روس کی مثال	63
پیغمبر اسلام کی ہدایت	22	ہندوستانی مسلمانوں کی جدید تاریخ	65
سیاسی بگاڑ	25	ایک شخص دو مثال	69
امام حسنؓ کا نمونہ	29	اصلاح کی طرف	72
امام حسینؓ کا نمونہ	31	اصل کمی	78
دو عملی نمونے	34	اسلام اکیسویں صدی میں	80
تاریخ امت	35	جاپان کی مثال	80
نمائندہ گروہ	36	خدائے واحد کی تلاش	82
ایک اہم سبق	39	آزادانہ تحقیق کا نتیجہ	84
اسلام کی طاقت	42	مذاہب کا تضاد	85
ایک جائزہ	44	اخوت ومساوات کا مذہب	87
حکمرانوں پر اثر	44	مادی مذہب کی ناکامی	89

داعیانہ جذبہ	92	مؤتہ کا سبق	144
پیغمبرانہ رہنمائی	95	دعوت کا میدان	146
اعلیٰ کامیابی کا راز	97	سبب اپنے اندر	150
صراط مستقیم	98	ایک مثال	152
ایمانی حوصلہ	98	موعود نہ کہ مقصود	154
فطرت سے مطابقت	100	چالیس سالہ انتظار	158
انقلابی زاویۂ نظر	104	ابتدائی عمل	160
نفس امّارہ، نفس لوّامہ	107	وقفۂ تعمیر	161
برائی کے بدلے بھلائی	111	اسلامی دعوت	163
تعمیر واستحکام	115	اسلام کیا ہے	164
خلاصہ کلام	118	جنّت کیا ہے	165
صبر ایک ابدی حکم	120	مومنانہ زندگی	166
دعوت کا دور	122	اسلامی دعوت	167
خلافت کا دور	123	اسلامی انقلاب	171
ملوکیت کا دور	126	پیغمبر کا کام	172
دعوت کی اہمیت	127	مسلم دنیا سے مغربی دنیا کی طرف	175
قربانیاں بےنتیجہ رہیں	127	جدید انقلاب کی اسلامی اہمیت	176
فرض منصبی سے غفلت	130	مغرب کا غلبہ مسلم دنیا پر	178
یہود کی مثال	131	سیاسی انقلاب کی نوعیت	179
دعوت شاہ کلید	133	مسلم دنیا میں سیاسی ردّعمل	180
آخری بات	135	موجودہ زمانے کی اسلامی تحریکیں	181
انا لکم ناصح امین	136	فخر نہیں ذمہ داری	183
احساس نصح کا فقدان	137	کرنے کا کام	186
احساس امانت کا فقدان	138	دعوت اور عمل	189
سیف اللہ کا پیغام	141	اصل رکاوٹ	191

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اتباعِ صراط، اتباعِ سُبل

پچھلی امتوں میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں، ان میں سے ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ اور خدا کے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا: مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ۔ (30:32)

یہی خطرہ شدید طور پر اگلی امت کے لیے بھی تھا۔ اس لیے قرآن و حدیث میں نہایت تاکید کے ساتھ اہلِ اسلام کو یہ نصیحت کی گئی کہ تم ان کی پیروی نہ کرنا: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (3:105) یعنی، اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور باہم اختلاف کر لیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح احکام آچکے تھے۔ اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس سلسلے میں قرآن میں جو ہدایات دی گئی ہیں، ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل آیت میں ملتا ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (6:153) یعنی، (اے پیغمبر کہہ دو کہ) یہ میری راہ ہے سیدھی۔ پس تم اس پر چلو اور (متفرق) راستوں پر نہ چلو وہ تم کو اللہ کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچو۔

اس آیت کی تشریح ایک روایت میں ملتی ہے۔ یہ روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ ابْنُ مَسْعُودٍ، رضي الله عنه -قَالَ: خَطَّ لنا رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يوماً خَطًّا بِيَدِهِ، ثُمَّ قَالَ : "هَذَا سَبِيل اللّٰهِ مُسْتَقِيمًا". وَخَطَّ عَلَى يَمِينِهِ وَشِمَالِهِ، ثُمَّ قَالَ: "هَذِهِ السُّبُل لَيْسَ مِنْهَا سَبِيلٌ إِلَّا عَلَيْهِ شَيْطَانٌ يَدْعُو إِلَيْهِ". ثُمَّ قَرَأَ: وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 4437) یعنی، حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز ہمارے سامنے ایک سیدھی لکیر کھینچی۔ پھر فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس سیدھی لکیر کے دائیں اور بائیں لکیریں کھینچیں پھر فرمایا کہ یہ متفرق راستے ہیں۔ ان میں سے ہر راستہ پر ایک شیطان ہے جو اس کی طرف بلاتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی: اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس تم اسی کی پیروی کرو۔ (6:153)

ان آیتوں اور حدیثوں کے مطابق عمل کے دو طریقے ہیں۔ ایک اتباع صراط، اور دوسرے اتباع سُبل۔ ان دونوں طریقوں میں جو فرق ہے وہ اسلام اور کفر کا نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ ان میں سے ایک کھلی ہوئی دینداری ہے اور دوسری کھلی ہوئی بے دینی۔ بلکہ یہ دونوں ہی دین کے نام پر کیے جانے والے عمل ہیں۔ تاہم دین کے نام پر کیے جانے کے باوجود ان میں سے ایک مطلوب دینداری ہے اور دوسری غیر مطلوب دینداری۔ چنانچہ قرآن کی دوسری سورہ میں ان میں سے ایک کو اقامتِ دین اور دوسرے کو تفرّق فی الدّین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (42:13)

اب دیکھیے کہ اتباع صراط کیا ہے اور اتباع سُبل کیا ہے۔ صراط کے معنی سیدھی اور وسیع شاہراہ کے ہیں۔ اور سُبل سے مراد متفرق راستے ہیں۔ دوسری آیتوں کے مطالعے سے معلوم

ہوتا ہے کہ صراط اور سُبل دراصل اصول اور فروع کی تعبیر ہے۔ صراط سے مراد دین کی اصولی اور اساسی تعلیمات ہیں اور سُبل سے مراد دین کی جزئی اور فروعی تعلیمات ہیں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل آیت کا مطالعہ کیجیے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحاً وَالَّذِي أَوْحَيْنا إِلَيْكَ وَما وَصَّيْنا بِهِ إِبْراهِيمَ وَمُوسى وَعِيسى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ۔ (42:13) یعنی، اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کردیا جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا، یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔

اصول اور فروع

اس آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم (اور آپ کی تبعیت میں تمام مسلمانوں) کو حکم دیا گیا ہے کہ جو "الدین"، پچھلے تمام پیغمبروں کو دیا گیا تھا، وہی تم کو بھی دیا گیا ہے۔ تم اس کی سچی پیروی کرو، اس میں تفریق نہ پیدا کرو۔ مفسرین نے صراحت کی ہے کہ اس آیت میں "الدّین" سے مراد صرف اساسی دین ہے، نہ کہ جزئیات و فروع سمیت تمام دین ۔ کیوں کہ قرآن سے ثابت ہے کہ اساسی دین کے علاوہ شریعت اور منہاج میں ایک پیغمبر اور دوسرے پیغمبر کے درمیان فرق تھا۔ اس لیے تمام پیغمبروں کی مشترک پیروی صرف اساسی اور اصولی دین میں ہوسکتی ہے جو کہ سب کے یہاں ایک رہا ہے، نہ کہ شریعت اور منہاج میں جس میں ایک پیغمبر اور دوسرے پیغمبر کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔

اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ سارا زور اور تاکید بنیادی تعلیمات پر دیا جائے۔ کیوں کہ

بقیہ تمام چیزیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس، اگر ضمنی اور فروعی باتوں کو زور و تاکید کا موضوع بنایا جائے تو یہ تغیر اہمیت (shift of emphasis) کے ہم معنی ہوگا، اور تغیر اہمیت کے بعد کبھی کسی قوم میں حقیقی دینی زندگی پیدا نہیں کی جاسکتی۔

جڑ اور شاخیں

قرآن میں کلمۂ ایمان کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ (14:24) یہ تشبیہ بہت بامعنی ہے۔ درخت کا ایک حصہ وہ ہے جو جڑ کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جو شاخوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہر کسان یہ جانتا ہے کہ کھاد اور پانی دینے کا کام اسے جڑ میں کرنا ہے، نہ کہ شاخوں میں۔ جڑ میں پانی دینا بالواسطہ طور پر شاخوں اور پتیوں میں بھی پانی دینا ہے۔ کیوں کہ پتیوں اور شاخوں کو جڑوں ہی سے طاقت ملتی ہے، نہ کہ خود پتیوں اور شاخوں سے۔

اسی طرح دین کی بھی ایک جڑ ہے، اور ایک اس کی شاخیں ہیں۔ دین کا باغ اُگانے کے لیے بھی اس کی جڑوں میں طاقت پہنچانا چاہیے۔ شاخوں پر عمل کرنے سے دین کا ہرا بھرا باغ کھڑا نہیں ہوسکتا۔ اسی حقیقت کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 52؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1599) یعنی، سن لو، بے شک جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہو تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سن لو، بے شک وہ قلب ہے۔

"قلب" اور "جسم" دو برابر درجے کی چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں اصل اور فرع کی نسبت ہے۔ قلب گویا جڑ کی مانند ہے اور جسم شاخ کی مانند۔ اگر ہم جسم کی درستگی چاہتے ہوں

تب بھی ہمیں قلب کی درستگی پر سارا زور صرف کرنا ہوگا۔ قلب کی درستگی پر زور دینا اگر ''اتباع صراط'' ہے تو جسم کی درستگی پر زور دینا ''اتباع سُبل۔''

اس اصول کو سامنے رکھ کر موجودہ زمانے کی مسلم تحریکوں کو دیکھیے تو مسلمانوں کی تقریباً تمام بڑی بڑی تحریکیں اتباعِ صراط کے بجائے اتباعِ سُبل کا نمونہ نظر آتی ہیں۔ یہ تحریکیں دین کی اصل شاہراہ پر سفر کرنے کے لیے نہیں اٹھائی گئیں۔ بلکہ متفرق راستوں میں سے کسی راستے پر دوڑنے کے لیے اُٹھائی جاتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تحریکوں کی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود دین کا باغ اب تک ہرا بھرا نہ ہوسکا۔ یہاں ہم کچھ مثالیں درج کرتے ہیں جن سے معاملے کی وضاحت ہوتی ہے۔

آفاقی حقیقت

اتباعِ صراط اور اتباعِ سُبل ایک عالم گیر حقیقت ہے۔ دنیا کے معاملات میں بھی اس کی اتنی ہی اہمیت ہے۔ جتنی دین کے معاملات میں۔ دنیوی معاملات میں اس کی اہمیت سمجھنے کے لیے یہاں ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

یہ مثال جاپان اور ہندستان سے متعلق ہے۔ جاپان اور ہندستان دونوں ملکوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنے دور جدید کا آغاز کیا۔ جاپان نے امریکی محکومی میں مبتلا ہو کر اور ہندستان نے برطانی محکومی سے آزاد ہو کر۔ عجیب بات ہے کہ چالیس سال بعد آج جاپان انتہائی ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل ہو چکا ہے۔ جب کہ ہندستان ابھی تک ''تیسری دنیا'' کے دائرے سے باہر آنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ جاپان نے جڑ کے مقام سے اپنی تعمیرِ نَو کا آغاز کیا۔ اور ہندستان نے شاخوں اور پتیوں کے مقام سے۔ ایک امریکی عالم ولیم اویوچی (William Ouchi) کے الفاظ میں جاپان نے جس چیز کو نمبر ایک کی اہمیت دی وہ اپنے کارکنوں کے اندر داعیہ

پیدا کرنا (motivation of the employees) تھا۔ اس مقصد کے لیے جاپان نے سب سے زیادہ زور نئی نسلوں کی سائنٹفک تعلیم پر دیا۔ اس نے اپنے بہترین وسائل اور بہترین دماغ ابتدائی تعلیم کے محاذ پر لگا دیے۔ اس نے اپنی پوری جدید نسل کے اندر یہ شعور پیدا کر دیا کہ زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت معیار (quality) کی ہے۔ اس کا نتیجہ جاپان میں زبردست صنعتی ترقی تھی۔ اس نے جدید تاریخ میں پہلی بار اپنی صنعتی پیداوار کو خالی از نقص (zero-defect) کے درجے تک پہنچا دیا — جاپان نے جڑ کے مسئلہ پر توجہ دی، اس کے نتیجے میں اس کی جڑ بھی مضبوط ہوئی اور اس کی شاخیں بھی ہری بھری ہو گئیں۔

ہندستان کی تصویر اس کے بالکل برعکس صورت حال کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ 1947ء میں آزادی کے بعد جن ہندستانی لیڈروں کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار آیا وہ حقیقت سے زیادہ ظواہر کو اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سب سے زیادہ جس چیز پر توجہ دی وہ شاندار عمارتیں کھڑی کرنا تھا۔ ہندستان کے حالات میں اصل کام کیریکٹر بلڈنگ کا تھا۔ مگر یہاں کے حکمرانوں نے سب سے زیادہ زور بھون بلڈنگ پر دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان کے شہر ایسے قبرستان بن گئے ہیں جہاں عالیشان عمارتوں کے اندر انصاف اور انسانیت کو دفن کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ رشوت اور لوٹ اور بدعنوانی کی ایک وسیع دنیا ہے جس کا دوسرا نام ہندستان ہے۔ 1947ء کے بعد ہندستانی رہنماؤں نے اگر صحیح معنوں میں کیرکٹر بلڈنگ پر زور دیا ہوتا تو آج ہندستان جاپان اور چین سے آگے ہوتا۔ مگر جب انھوں نے بھون بلڈنگ پر زور دیا تو ان کے حصے میں صرف ایک ایسا ہندستان آیا جہاں کرپشن کی بھرمار نے ترقی کا امکان ہی سرے سے ختم کر دیا ہو۔

ایک مثال

دینی اعتبار سے اتباعِ صراط اور اتباعِ سُبل کیا ہے اور ان دونوں میں کیا فرق ہے،

اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم عرب میں شراب بندی کا حکم جاری کیا تو حکم جاری ہونے کے ساتھ ہی شراب نوشی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے برعکس، موجودہ زمانے میں پاکستان اور سوڈان جیسے ملکوں میں وہاں کے حکمرانوں نے شراب بندی کا حکم جاری کیا مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ جو شراب پہلے اوپن مارکیٹ میں بکتی تھی وہ اب بلیک مارکیٹ میں فروخت ہونے لگی۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے زمین تیار کی اور اس کے بعد شراب کی حرمت کا اعلان فرمایا۔ جب کہ موجودہ زمانہ کے مسلم حکمراں زمین تیار کیے بغیر حرمتِ شراب کا قانون جاری کرنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار کی وضاحت کے لیے یہاں ہم حضرت عائشہ کی ایک روایت نقل کرتے ہیں:

> إِنَّمَا نَزَلَ أَوَّلَ مَا نَزَلَ منه سُورَةٌ مِنَ الْمُفَصَّلِ، فيها ذِكْرُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، حَتَّى إذا ثَابَ النَّاسُ إلى الإِسْلَامِ نَزَلَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ، وَلَوْ نَزَلَ أَوَّلَ شَيْءٍ: لَا تَشْرَبُوا الْخَمْرَ، لَقَالُوا: لَا نَدَعُ الْخَمْرَ أَبَدًا، وَلَوْ نَزَلَ: لَا تَزْنُوا، لَقَالُوا: لَا نَدَعُ الزِّنَا أَبَدًا۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر، 4993) یعنی، قرآن میں ابتداءً وہ سورتیں اتاری گئیں جن میں جنت اور جہنم کا تذکرہ تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے اس وقت حلال اور حرام کا حکم اُتارا گیا۔ اور اگر شروع ہی میں یہ حکم آجاتا کہ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر شروع ہی میں یہ اترتا کہ زنا نہ کرو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔

موجودہ زمانے میں جن مسلم ملکوں میں شراب اور فواحش کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں وہ اسی دوسری قسم میں آتے ہیں جس کا ذکر حضرت عائشہ نے اپنی حدیث کے آخر میں کیا ہے۔

دعوت کے بجائے تحفظ

1947ء سے پہلے ہندستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ وہ ملک کے اکثریتی فرقے کی طرف سے خطرہ محسوس کررہے تھے۔ مثال کے طور پر ان کو یہ اندیشہ تھا کہ آزادی کے بعد مشترک ہندستان میں اردو کا مستقبل غیر محفوظ ہو جائے گا۔ ''ہندو حکومت'' اور ''ہندی پرچارنی سبھا'' اردو کو کھا جائیں گے۔ اس لیے انھوں نے پُرزور مطالبہ کیا کہ ہم کو ایک الگ ہوم لینڈ دیا جائے۔ تاکہ ہم وہاں اردو زبان کی حفاظت کرسکیں۔ اس عنوان پر مسلم عوام کی تائید حاصل کرنے کے لیے دھواں دھار تحریک چلائی گئی۔ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی کہ اردو ہے تو اسلام ہے۔ اردو نہیں تو اسلام بھی نہیں۔

تحریک کامیاب ہوئی۔ اردو قوم کو ایک ہوم لینڈ مل گیا۔ مگر اس کے بعد 1971ء میں بنگلہ دیش میں اور 1987ء میں سندھ میں اردو دانوں اور غیر اردو دانوں کے درمیان جو خونریز فسادات ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ سوچ سراسر غلط تھی۔

جو لوگ ''ہندو ظلم'' کی شکایت کرتے تھے کیا وجہ ہے کہ وہ لوگ خود اپنے بھائیوں کے خلاف شدید تر ظلم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان کا باہمی اختلاف یہاں تک پہنچا ہے کہ پاکستان کے ایک کروڑ اردو بولنے والے ''مہاجر قومیت'' کے نام سے دوبارہ اپنی علاحدہ قومیت کا مطالبہ کررہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں نے ان کے ذہن میں یہ بات بھری تھی کہ اردو اور اسلام دونوں ایک ہیں۔ اردو کا تحفظ اسلام کا تحفظ ہے۔ اس ذہن کو لے کر جب وہ پاکستان گئے تو انھوں نے عین اپنے مزاج کے تحت اردو کے تحفظ کو اپنا اہم ترین مسئلہ قرار دیا۔ غیر منقسم ہندستان میں اردو کا تحفظ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے تحفظ کے ہم معنی تھا۔ مگر پاکستان میں وہ خود مسلمان کے مقابلے میں مسلمان کے تحفظ کے ہم معنی بن گیا۔ کیوں کہ وہاں کے لوگوں کی مادری زبانیں بنگالی اور پنجابی اور سندھی، وغیرہ

تھیں، نہ کہ اردو۔ غیر منقسم ہندستان میں جو نعرہ بظاہر تحفظ اسلام نظر آرہا تھا وہ پاکستان پہنچ کر تخریب اسلام کے ہم معنی بن گیا۔

قدیم غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کے لیے جڑ کا کام دعوت دین کا کام تھا۔ اور اردو یا تہذیبی مظاہر کا تحفظ صرف شاخوں کا کام۔ ہندستانی مسلمانوں نے جڑ کے کام کو چھوڑ دیا۔ وہ شاخوں اور پتیوں کے مسئلے پر ہنگامہ آرائی کرتے رہے۔ مسلمان اگر جڑ والا کام کرتے تو تقریباً یقینی ہے کہ آج ہندستان کی تاریخ دوسری ہوتی۔ اس کے برعکس، جب انھوں نے شاخوں والا کام کیا تو اس کے حصے میں ذلت اور بربادی کے سوا کچھ نہ آیا۔ وہ ہندستان میں کوئی قابلِ ذکر تاریخ بنا سکے اور نہ پاکستان میں۔

داخل کے بجائے خارج

ہندستان میں پچھلی تقریباً نصف صدی سے جو مسئلہ مسلمانوں کے ذہنوں پر سب سے زیادہ چھایا رہا ہے، وہ ہندو ظلم کا مسئلہ ہے۔ اس مدت میں مسلمانوں نے اپنی سب سے زیادہ طاقت اسی مسئلے پر خرچ کی ہے۔ مگر نتیجے کے اعتبار سے دیکھیے تو اب تک مسلمان کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملے میں مسلمانوں کی تمام کوششیں اتباعِ سبل کے طریقہ پر چل رہی ہیں، وہ اتباعِ صراط کے طریقہ پر نہیں چل رہی ہیں۔ اور یہی ان کی ناکامی کی اصل وجہ ہے۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مسلمان جو کوششیں کر رہے ہیں، وہ بظاہر مختلف اور متعدد ہیں۔ مگر وسیع تر تقسیم میں ان سب کا خلاصہ ایک ہے۔ وہ سب کی سب "خارج رخی" ہیں، ان میں سے کوئی بھی "داخل رخی" نہیں۔ یہ تمام کی تمام تحریکیں مسلمانوں کے مسائل کو ہندو فرقہ پرستی کے خانے میں ڈال رہی ہیں۔ وہ مسلمانوں کو بے قصور ٹھہراتے ہوئے یک طرفہ طور پر اکثریتی فرقے کے خلاف فریاد و احتجاج کا طوفان برپا کرنے میں مشغول ہیں۔

یہ واضح طور پر "اتباع سُبل" ہے۔ کیوں کہ قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق مسلمانوں کو دوسروں کی سازشیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ مسلمانوں کو جب بھی کوئی نقصان پہنچے گا وہ اصلاً ان کی داخلی کمزوریوں کے سبب سے پہنچے گا۔ خدا و رسول کے ان فرمودات کے مطابق ہندستانی مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ تمام معاملے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے ہوئے اپنی داخلی اصلاح کی مہم میں لگ جاتے۔ اس کے بجائے وہ فریقِ ثانی کے خلاف چیخ پکار کے راستے پر چل پڑے۔ اس طرح انھوں نے اتباعِ صراط کے بجائے اتباع سُبل کا طریقہ اختیار کیا۔ اور جو لوگ اتباعِ سبل کا طریقہ اختیار کریں انھیں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

ہندستانی مسلمانوں کے لیے جڑ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی اندرونی کمزوریوں کو دور کریں۔ اندرونی کمزوریوں کو دور کرنے کے بعد کسی کو ان کے اوپر دست درازی کا موقع ہی نہیں ملے گا۔

تبدیلیِ انسان کے بجائے تبدیلیِ حکومت

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ مغربی قومیں جدید طاقتوں سے مسلح ہو کر اپنے علاقوں سے نکلیں اور لاکھوں نے ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی تقریباً پوری مسلم دنیا پر سیاسی غلبہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد خود اللہ تعالیٰ نے ان کے "دفع" کا انتظام کیا۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم نے مغربی اقوام کو اتنا کمزور کر دیا کہ ان کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ خود اپنی طاقت سے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں پر اپنا قبضہ باقی رکھ سکیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک کے بعد ایک اپنے مقبوضہ ملکوں کو آزاد کرنا شروع کیا یہاں تک کہ بیسویں صدی کے وسط تک تمام مسلم ممالک ان کے سیاسی قبضے سے آزاد ہو گئے۔

آزادی کے بعد ان ملکوں کی حکومت جن مسلم افراد کے ہاتھ میں آئی وہ اگر چہ مغربی طرز

کی تعلیم پائے ہوئے تھے۔ مگر قدیم روایتی نظام کا اثر بھی ان کے اوپر نہایت گہرا تھا۔ وہ خواہ بظاہر ''کوٹ پتلون'' پہنتے ہوں مگر ان کے دلوں میں اسلام کے لیے نرم گوشہ موجود تھا۔ یہ ایک زبردست امکان تھا جس کو استعمال کرکے آزاد شدہ مسلم ممالک میں اسلام کے ایک نئے دور کا آغاز کیا جا سکتا تھا۔ مگر مسلمانوں کے دینی رہنماؤں نے ہر جگہ صرف مواقع کو برباد کرنے کا کام انجام دیا ہے۔ وہ کہیں بھی مواقع کو استعمال کرنے کی لیاقت کا ثبوت نہ دے سکے۔ اس کی واحد وجہ یہی تھی کہ وہ ''اتباعِ سُبل'' کے طریقے پر دوڑتے رہے، وہ ''اتباعِ صراط'' کا طریقہ اختیار کرنے میں ناکام رہے۔

اس سلسلے میں مصر اور پاکستان کی مثال لیجیے۔ مصر میں شاہ فاروق کی حکومت ختم ہونے کے بعد فوجی افسر برسرِ اقتدار آئے۔ ان فوجی افسروں کے دل میں اسلام کی گہری ہمدردی موجود تھی۔ انھوں نے وہاں کی دینی جماعت (الاخوان المسلمون) کو ملک کی وزارتِ تعلیم کی پیش کش کی۔ انہوں نے کہا کہ آپ ملک کے تعلیمی نظام کو اپنے ہاتھ میں لے کر جدید نسل کی تربیت کیجیے اور یہاں اسلام کے لیے ایک نئے مستقبل کی داغ بیل ڈالیے۔ مگر مصر کی دینی جماعت کے رہنما اس پیش کش کو قبول نہ کر سکے۔ اس کے برعکس، انھوں نے خود فوجی حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی لاحاصل کوشش شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دینی رہنماؤں اور فوجی حکمرانوں میں ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ تمام بہترین مواقع برباد ہو کر رہ گئے۔

یہی صورت حال پاکستان میں پیش آئی۔ پاکستان کے سابق حکمراں جنرل محمد ایوب خاں نے وہاں کی دینی جماعت (جماعت اسلامی پاکستان) کو پیش کش کی کہ آپ لوگ ایک انٹرنیشنل معیار کی اسلامی یونیورسٹی بنائیے۔ اس کا سارا خرچ حکومت فراہم کرے گی۔ حکومت کی اس پیشکش کو قبول کرکے وہاں کے دینی رہنما ایک نئی مسلم نسل تیار کر سکتے تھے جو دور

جدید میں اسلام کے احیاء کا کام کر سکے۔ مگر پاکستان کے دینی رہنما دوبارہ اس مہم میں لگ گئے کہ وہ حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کریں۔ نتیجہ دوبارہ یہی ہوا کہ تمام بہترین تعمیری امکانات باہمی ٹکراؤ میں برباد ہو گئے اور بالآخر ملت کے حصے میں کچھ بھی نہ آیا۔

کلیات کے بجائے جزئیات

اسلامی شریعت کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک کلیات اور دوسرے جزئیات۔ شریعت کے کلی احکام واضح نصوص پر مشتمل ہیں۔ اس لیے ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ شریعت کے اس پہلو پر تمام فقہاء یکساں طور پر متفق ہیں۔ مگر جزئیات کے شرع میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لیے شریعت کے اس حصے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ فجر کی نماز دو رکعت، ظہر کی نماز چار رکعت اور مغرب کی نماز تین رکعت ہے۔ مگر نماز کے بعض جزئی مسائل مثلاً آمین، رفع یدین اور قرأتِ فاتحہ خلف الامام کے معاملہ میں ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

بعد کے دور میں مسلمانوں کے درمیان جو مختلف فقہی مکاتب بنے ان کے الگ الگ ہونے کی بنیاد دراصل یہی اختلافی جزئیات تھیں۔ کلی نوعیت کے احکام میں الگ الگ فقہی مکتب بننے کا کوئی سوال نہیں۔ کیوں کہ ان امور میں ایک فقیہ اور دوسرے فقیہ کی رائے میں کوئی فرق ہی نہیں۔ ایک فقہی مکتب کو دوسرے فقہی مکتب سے جو چیز جدا کرتی ہے وہ دراصل اختلافی مسائل ہیں، نہ کہ اتفاقی مسائل۔

موجودہ زمانے میں ہندستان میں جو دینی مدارس قائم ہوئے وہ کسی ایک یا دوسرے فقہی مکتب فکر کے تحت قائم ہوئے۔ مثلاً کوئی مدرسہ دیوبندی مسلک کے تحت قائم ہوا اور کوئی بریلوی مسلک کے تحت اور کوئی سلفی مسلک کے تحت۔ ان مسالک کو جو چیز ایک دوسرے سے ممیز کرتی ہے وہ یہی اختلافی مسائل ہیں، نہ کہ اتفاقی مسائل۔ اس بنا پر عملاً یہ

ہوا کہ ہر مدرسے میں سب سے زیادہ زور اختلافی مسائل پر دیا جانے لگا۔ ہر مدرسے کا مقصد یہ قرار پایا کہ وہ دوسرے مسلک کے بالمقابل اپنے مسلک کو قرآن وسنت سے صحیح ثابت کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا سارا تعلیمی نظام اختلافی جزئیات کے گرد گھومنے لگا۔ مثال کے طور پر ہماری موجودہ درس گاہوں کا یہ حال ہے کہ وہاں جب حدیث پڑھائی جاتی ہے تو توحید اور آخرت سے متعلق حدیثوں سے استاد اور شاگرد بالکل سرسری گزر جاتے ہیں۔ اور جہاں کوئی ایسی حدیث آ گئی جس میں ایک مسلک اور دوسرے مسلک کے درمیان اختلاف کا پہلو پایا جاتا ہو وہاں استاد زبردست مہارت دکھاتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات اس پر ایک ایک ہفتے تک بحث ہوتی رہتی ہے۔

اس تعلیمی نظام سے جو لوگ تربیت پا کر نکلتے ہیں قدرتی طور پر ان کے ذہن پر کلیاتِ شریعت سے زیادہ جزئیاتِ شریعت کا غلبہ رہتا ہے۔ وہ انھی اختلافی جزئیات میں اپنے مسلک کو برتر ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کا بدترین انجام موجودہ زمانے میں یہ نکلا ہے کہ یورپ، امریکہ میں مقیم مسلمانوں نے ان علماء کو بطور امام اور مدرس بلایا تو وہاں پہنچ کر بھی انھوں نے یہی تمام جھگڑے چھیڑ دیے ۔ ہمارے علماء کے لیے یورپ اور امریکہ پہنچنا اس کا وسیلہ نہ بن سکا کہ وہ ان ملکوں میں اسلامی دعوت کا کام کریں۔ وہ وہاں بھی وہی کرتے رہے جس کی مہارت انہوں نے اپنی درسگاہوں میں حاصل کی تھی۔ یعنی جزئی اختلافی امور پر مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنا۔

سبب کے بجائے مرض

1985-86ء میں ہندستان کے مسلمانوں نے اپنی حالیہ تاریخ کی غالباً سب سے بڑی تحریک چلائی۔ یہ تحریک آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تحت چلائی گئی جس میں مسلمانوں کے تمام اکابر اور ان کی تمام تنظیمیں شریک تھیں۔ اس میں غالباً صرف ایک ہی قابل ذکر استثنا

تھا اور وہ تبلیغی جماعت کا تھا۔ تبلیغی جماعت بحیثیت جماعت اس مہم سے الگ رہی۔

یہ مہم محمد احمد۔ شاہ بانو بیگم کے کیس پر سپریم کورٹ آف انڈیا کے فیصلے کے بعد چلائی گئی۔ سپریم کورٹ نے شاہ بانو بیگم کی درخواست پر اس کے سابقہ شوہر کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی (شاہ بانو) کو 180 روپے ماہوار بطور گزارہ ادا کرے۔ اسلامی شریعت میں چوں کہ مطلقہ کے لیے صرف وقتی متاع ہے، نہ کہ مستقل گزارہ۔ اس لیے مسلم رہنماؤں کو سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ شریعت میں مداخلت نظر آیا اور انہوں نے اس فیصلے کو کالعدم کرنے کے لیے اس کے خلاف طوفانی مہم شروع کردی۔

لیکن گہرائی کے ساتھ غور کیجیے تو شاہ بانو بیگم کا واقعہ محض ایک علامت ہے، نہ کہ اصل سبب۔ اس قسم کے واقعات کا اصل سبب یہ ہے کہ موجودہ مسلم معاشرے میں اسلامی قانون کا احترام ختم ہو گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں مختلف علامتیں ظاہر ہو رہی ہیں جن میں سے ایک وہ واقعہ تھا جس کا مظاہرہ شاہ بانو بیگم کے واقعے کی صورت میں ہوا۔

اصل یہ ہے کہ طلاق کے دو طریقے ہیں۔ ایک طلاقِ سنّت اور دوسرا طلاقِ بدعت۔ طلاقِ سنّت یہ ہے کہ تین طہر میں الگ الگ طلاق دی جائے۔ بالفاظِ دیگر طلاق کے عمل کی تکمیل تین مہینہ میں ہو۔ اس کے مقابلے میں طلاقِ بدعت یہ ہے کہ آدمی بیک وقت طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر اپنی بیوی کو علاحدہ کردے۔ تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ طلاقِ سنّت ہی طلاق کا صحیح شرعی طریقہ ہے۔ طلاقِ بدعت طلاق کا غلط طریقہ ہے۔ اس معاملے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف اگر ہے تو اس معاملے میں ہے کہ کوئی شخص اگر ایک ہی مجلس میں تین طلاق دے بیٹھے تو یہ طلاق عملاً واقع ہوگی یا نہیں۔

اب موجودہ مسلم معاشرہ کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ مسلمانوں میں تقریباً صد فی صد طلاقِ بدعت کا طریقہ رائج ہو گیا ہے اور یہی فساد کی اصل جڑ ہے۔ اگر لوگ طلاق کے مقررہ

طریقے (طلاقِ سنّت) پر عمل کریں تو یقینی طور پر طلاقوں کی تعداد میں 99 فیصد تک کمی ہو جائے گی۔ کیوں کہ بیشتر طلاق وقتی غصے کے تحت دیے جاتے ہیں۔ غصہ اترتے ہی آدمی کو احساس ہونے لگتا ہے کہ اس نے غلط کیا۔ ایسی حالت میں اگر تین طہر میں طلاق دینے کا رواج پڑ جائے تو دوسرے اور تیسرے طہر کی نوبت ہی نہیں آئے گی اور آدمی طلاق سے رجوع کرکے اپنی بیوی کے ساتھ معمول کی زندگی گزارنے لگے گا۔

اس اعتبار سے دیکھیے تو مسلم رہنماؤں کے لیے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ جڑ کی اصلاح کریں مگر وہ شاخوں کے مسئلے پر دھوم مچا رہے ہیں۔ اگر وہ واقعتاً اس اعتبار سے مسلم معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ وہ مسلم معاشرے کے خلاف مہم چلائیں، نہ کہ سپریم کورٹ کے خلاف۔ انہیں مسلمانوں کی ہر بستی اور ہر محلے میں پہنچ کر مسلمانوں سے کہنا چاہیے کہ تم لوگ اسلامی شریعت کے مطابق ازدواجی زندگی گزارو۔ اور اگر تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے تو اس کو طلاق کا عمل طلاقِ سنّت کے مطابق انجام دینا چاہیے، نہ کہ طلاقِ بدعت کے مطابق، جو اسلام میں واضح طور پر منع ہے۔ ہمارے رہنماؤں نے پچھلے چند سالوں میں سپریم کورٹ اور حکومت ہند کے خلاف جتنی دھوم مچائی ہے اتنی ہی دھوم اگر انھوں نے موجودہ مسلم معاشرے کے خلاف مچائی ہوتی تو یقیناً یہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہو چکا ہوتا۔ کیوں کہ یہ مرض کے اصل سبب پر عمل کرنا ہوتا۔ مگر جب انھوں نے سبب پر عمل نہیں کیا اور علامت کے خلاف ہنگامہ آرائی کرتے رہے تو ان کی ساری جدو جہد حبطِ اعمال کا شکار ہو کر رہ گئی۔ وہ ایک فیصد بھی مسلم معاشرے کی اصلاح نہ کر سکے۔

اس سلسلے کی ایک عبرت ناک خبر وہ ہے جو دہلی کے ایک مسلم اخبار میں شایع ہوئی ہے۔ اس خبر کے الفاظ یہ ہیں: ”اودے پور (راجستھان) کی ایک خاتون نے ہندوستانی

پارلیمنٹ کے ایک مسلم ممبر کو ایک خط لکھا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ چوں کہ (مسلم پرسنل لاء بورڈ کے مطابق) طلاق کے بعد شوہر پر نفقہ دینا تاحیات لازم نہیں، اس لیے سینکڑوں عورتیں اس طرف ہندو مذہب اختیار کر رہی ہیں۔ آپ کوشش کر کے ایسا قانون بنوائیے جس کے ذریعے ہندو عورتوں کی طرح مسلمان عورتوں کو بھی طلاق کے بعد شوہر سے تازندگی نفقہ مل سکے۔ تاکہ مسلمان عورتیں بھی معاشرہ میں اچھی زندگی گزار سکیں۔" (سہ روزہ دعوت 13 جولائی 1987ء)

مسلم مطلقہ کے حقوق کے تحفظ کا بل جو ہنگامہ خیز تحریک کے بعد 6 مئی 1986ء کو ہندوستانی پارلیمنٹ سے پاس کرایا گیا تھا، عملاً وہ بالکل بے معنی ثابت ہوا۔ اس واقعہ کا اعتراف خود آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نویں اجلاس میں کیا گیا ہے جو کانپور میں 5-4 مارچ 1989ء کو منعقد ہوا تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبہ صدارت میں اعتراف کیا کہ اس بل کے سلسلے میں "مسلمانوں کی تاریخی بلکہ تاریخ ساز جدوجہد لاحاصل اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مصداق" ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ "یہ پاس شدہ بل اوراق کی زینت بن کر رہ جائے گا۔" اس بنا پر مولانا موصوف نے اس ضرورت کا اظہار کیا کہ دوبارہ نیا بل ترمیم شدہ شکل میں پاس کرایا جائے۔ (تعمیر حیات، 25 مئی، 1989)

راہ عمل

اسلام میں زندگی کا جوتصور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس دنیا کے بنانے والے نے اس کواس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہمیشہ عُسر کے ساتھ یُسر موجود رہتا ہے۔ ایک اعتبار سے اگر مشکل ہوتو دوسرے اعتبار سے آسانی بھی ضرور یہاں پائی جائے گی۔ یہاں وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔(94:5-6) پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس دنیا میں اگر مسائل پائے جاتے ہیں تو عین اسی کے ساتھ یہاں ہمیشہ مواقع بھی موجود رہتے ہیں۔ بصیرت سے خالی آدمی ہمیشہ مسائل میں اُلجھا رہتا ہے۔ مگر جس آدمی کو خدا نے بصیرت کی روشنی دی ہو وہ مسائل سے گزر کر مواقع کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ مسائل کو نظر انداز کر کے اپنی ساری توجہ مواقع کو استعمال کرنے پر لگا دیتا ہے۔

اسی کا نام اسلامی حکمت ہے۔ اسلامی حکمت عُسر میں یُسر کو دیکھتی ہے۔ اسلامی طریق کار کے اصول کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ مسائل کو بھوکا رکھو اور مواقع کو کھلاؤ:

"Starve the problems, feed the opportunities."

یہی وہ خاص تدبیر کار ہے جس کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ اعراض کے معنی اجتناب کے ہیں، یعنی اوائڈ کرنا۔ براہ راست ٹکراؤ کے مقام سے ہٹ کر اپنے لیے کوششوں کا میدان پا لینا۔

اس اعراض کا تعلق ایک شخص کی ذاتی زندگی سے بھی ہے، اور پوری ملت کی اجتماعی زندگی سے بھی۔ آپ اپنے راستے پر چلے جارہے ہیں۔ درمیان میں ایک شخص آپ کو مشتعل کرنے والی حرکت کرتا ہے۔ آپ اس سے مشتعل نہیں ہوتے، اور اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں، یہ ذاتی زندگی کا اعراض ہے۔ اعراض کے اس اصول پر جو شخص عمل نہ کرے وہ ہمیشہ نادانوں کی نادانی کا شکار ہوتا رہے گا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح ملت کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ کوئی خارجی مسئلہ ایک اشتعال بن کر اس کے سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر حکمرانوں کا سیاسی بگاڑ۔ ایسے مواقع پر تمام رہنما یہ کرتے ہیں کہ وہ اصلاح سیاست کے نام پر حکمرانوں سے لڑ جاتے ہیں۔ مگر یہ اسلام کا طریقہ نہیں۔ یہاں بھی اسلامی طریقہ یہی ہے کہ اعراض سے کام لیا جائے۔ اور سیاسی ٹکراؤ سے اجتناب کرتے ہوئے دوسرے میدانوں میں اپنی کوششوں کو وقف کردیا جائے۔

سیاسی ٹکراؤ سے سماج میں تخریبی سرگرمیاں جنم لیتی ہیں۔ اس کے برعکس، اگر اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے تو سماج کے اندر تعمیری سرگرمیاں فروغ پاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سیاسی ٹکراؤ کو چھوڑ کر تعمیری میدان میں سرگرم ہونے کا حکم دیا ہے۔

پیغمبر اسلام کی ہدایت

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں آئی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب حکومت سے نزاع کرنے کو منع فرمایا: حضرت عبادہ بن الصامت انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیعت لی تو اس میں ہم سے جن چیزوں کا عہد لیا، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ ہم اصحابِ امر سے جھگڑا نہیں کریں گے: وَعلٰی أَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7055)

- سَمِعْتُ عَوْفَ بْنَ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيَّ يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم یقولوَشِرَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ، وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ. قَالُوا: قُلْنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَفَلَا نُنَابِذُهُمْ عِنْدَ ذَلِكَ؟ قَالَ لَا، مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلَاةَ، لَا، مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلَاةَ۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1855) یعنی عوف بن مالک الاشجعی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ لوگ بہت برے امیر ہیں جو تم سے نفرت کریں اور تم ان سے نفرت کرو۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، جب ایسا ہو تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم رکھیں، نہیں جب تک وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم رکھیں۔
- عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد تم بہت سی برائیاں اور حکومت میں بگاڑ دیکھو گے۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ اس وقت کے لیے ہم کو کیا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ان کا حق انہیں ادا کرو اور اپنا حق اللہ سے مانگو: أَدُّوا إِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ وَسَلُوا اللّٰهَ حَقَّكُمْ۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7052)
- وائل بن حجر کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہمارے اوپر ایسے حکمراں قائم ہو جائیں جو اپنا حق ہم سے مانگیں اور ہمارا حق ہم کو نہ دیں۔ تو ایسے وقت میں آپ ہمیں کیا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سنو اور اطاعت کرو، کیوں کہ ان کے اوپر ان کی ذمہ داری ہے اور تمہارے اوپر تمہاری ذمہ داری: اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2199)

- عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے امیر کی طرف سے ایسی بات دیکھے جو اس کو ناپسند ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اس پر صبر کرے۔ مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَصْبِرْ عَلَيْهِ۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6646)
- إِذَا عَدَلَ السُّلْطَانُ فَعَلَى الرَّعِيَّةِ الشُّكْرُ، وَلِلسُّلْطَانِ الْأَجْرُ. وَإِذَا جَارَ فَعَلَى الرَّعِيَّةِ الصَّبْرُ، وَعَلَى السُّلْطَانِ الْوِزْرُ۔ (شرح السیر الکبیر: للسرخسی، صفحہ 158) یعنی عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلطان اگر عدل کرے تو اس کی رعایا کو چاہیے کہ وہ شکر کرے اور اگر وہ ظلم کرے تو رعایا کو چاہیے کہ وہ صبر کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کا مطلب بے عملی نہیں، وہ عین عمل ہے۔ وہ انفعالیت نہیں بلکہ فعالیت کا سبق دیتی ہے۔ وہ حکمتِ عمل ہے، نہ کہ ترکِ عمل۔ وہ پسپائی نہیں بلکہ اقدام کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت، سماج کے تابع ہوتی ہے، نہ کہ سماج حکومت کے تابع۔ اس لیے اگر کوئی شخص حکومت میں خرابی دیکھے تو اس کو سماج کی سطح پر اپنا اصلاحی عمل جاری کر دینا چاہیے۔ یہی اصلاح کا صحیح اور اسلامی طریقہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی نزاع سے روکنے کا مطلب دراصل کوششوں کا رخ پھیرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست کے میدان میں سر نہ ٹکراؤ، بلکہ تعمیر کے میدان میں اپنا کام شروع کر دو، اس طرح تم زیادہ بہتر طور پر اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہو۔

درخت کی پتیاں مرجھائیں تو کوئی بھی شخص ایسا نہیں کرتا کہ وہ پتیوں پر پانی بہائے۔ اس کے برعکس وہ درخت کی جڑوں میں پانی ڈالتا ہے۔ کسی کے بلب میں کرنٹ نہ آرہا ہو تو

وہ بلب پر محنت نہیں کرتا، بلکہ پاور ہاؤس سے ربط قائم کرتا ہے۔ کیوں کہ جڑ میں پانی ہونے سے درخت کی پتیاں سرسبز ہوتی ہیں۔ اسی طرح بلب اس وقت روشن ہوتا ہے جب کہ پاور ہاؤس سے اس کو کرنٹ بھیجا جا رہا ہو۔

یہی معاملہ انسانی سماج کا بھی ہے۔ انسانی سماج کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک، حکمراں افراد اور دوسرے عوام۔ عوام کی حیثیت جڑ کی ہے اور حکمراں افراد کی حیثیت پتیوں کی۔ یا عوام بمنزلہ پاور ہاؤس ہیں اور حکمراں افراد بمنزلہ بلب۔ ایسی حالت میں یہاں بھی بگاڑ کی اصلاح کا صحیح طریقہ وہی ہے جو درخت اور پاور ہاؤس کی مثال میں پایا جاتا ہے۔ اگر حکمراں افراد کے اندر بگاڑ نظر آئے تو حکمراں افراد سے نہ لڑیے بلکہ عوام کی اصلاح شروع کر دیجیے ۔ پتیوں کے مسئلے کو جڑ کی سطح پر حل کیجیے۔ حکمراں افراد کے اندر بگاڑ دیکھ کر حکمراں افراد سے لڑ نا صرف سماجی تخریب میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر ایسا کیا جائے کہ حکمراں افراد میں بگاڑ ظاہر ہونے کے مواقع پر عوامی اصلاح کے محاذ پر جدو جہد کی جائے تو اس سے سماج کی تعمیر ہوتی ہے اور اس کے بعد نتیجتاً حکمراں طبقے کی اصلاح۔

یہی وہ اہم سماجی مصلحت ہے جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ تم جیسے ہوگے اسی طرح کے حکمراں تمہارے اوپر مقرر کیے جائیں گے: كَمَا تَكُونُونَ كَذَلِكَ يُؤمر عَلَيْكُم۔ (مسند الشہاب القضاعی، حدیث نمبر 577) مٹی سے برتن بنتا ہے، برتن سے مٹی نہیں بنتی۔ اسی طرح عوام سے حکومت بنتی ہے، حکومت سے عوام کی تشکیل نہیں ہوتی۔ اس لیے جو شخص حقیقی معنوں میں نتیجہ دیکھنا چاہتا ہو، اس کو چاہیے کہ وہ سماج کو اپنی اصلاحی جدو جہد کا نشانہ بنائے۔ افرادِ حکومت سے ٹکراؤ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

سیاسی بگاڑ

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے ان تمام باتوں کو بیان کیا جو آپ کے زمانے سے لے کر قیامت برپا ہونے تک پیش آئیں گی۔ آپ نے ان میں سے کسی بات کو بھی بیان کیے بغیر نہیں چھوڑا: قَامَ فِينَا رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مَقَامًا، مَا تَرَكَ شَيْئًا يَكُونُ فِي مَقَامِهِ ذَلِكَ إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ إِلَّا حَدَّثَ بِهِ۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2891)

حضرت حذیفہ ایک اور روایت میں کہتے ہیں کہ دوسرے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کے بارے میں پوچھتے تھے۔ مگر میں آپ سے شر کے بارے میں پوچھتا تھا، اس ڈر سے کہ کہیں وہ مجھ کو پکڑ نہ لے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ہم جاہلیت اور شر میں تھے، یہاں تک کہ اللہ اس خیر کو ہمارے درمیان لے آیا۔ پھر کیا اس خیر کے بعد دوبارہ شر ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں دوبارہ شر ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اس وقت کے لیے آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حاکم کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو، خواہ تمہاری پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں اور تمہارا مال چھینا جائے، تب بھی سنو اور اطاعت کرو: تَسْمَعُ وَتُطِيعُ الْأَمِيرَ، وَإِنْ ضَرَبَ ظَهْرَكَ وَأَخَذَ مَالَكَ فَاسْمَعْ وَأَطِعْ۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1847) دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین زمانوں کی بابت فرمایا ہے کہ وہ خیر کا زمانہ ہوگا — دور رسالت، دور صحابہ، دور تابعین۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ لوگوں میں بہتر کون ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرے زمانہ کے لوگ، اس کے بعد دوسرا، اور اس کے بعد تیسرا: سَأَلَ رَجُلٌ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ؟ قَالَ: الْقَرْنُ الَّذِي أَنَا فِيهِ، ثُمَّ الثَّانِي ثُمَّ الثَّالِثُ۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 25233)

احادیث سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ جب برا زمانہ شروع ہوگا تو وہ برابر جاری رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ صحیح بخاری میں زبیر بن عدی سے روایت ہے کہ ہم حضرت انس بن مالک کے پاس آئے اوران سے حجاج بن یوسف کے ظلم کی شکایت کی۔ انہوں نے کہا کہ صبر کرو۔ کیوں کہ اب تمہارے اوپر جو زمانہ بھی آئے گا وہ اور بھی زیادہ برا ہوگا، یہ حالت جاری رہے گی، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو، ایسا ہی میں نے تمہارے نبی سے سنا ہے: اصْبِرُوا، فَإِنَّهُ لَا يَأْتِي عَلَيْكُمْ زَمَانٌ إِلَّا الَّذِي بَعْدَهُ شَرٌّ مِنْهُ، حَتَّى تَلْقَوْا رَبَّكُمْ، سَمِعْتُهُ مِنْ نَبِيِّكُمْ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6657)

صحیح مسلم میں حضرت ابوبکرہ کی روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک آئندہ فتنے ہوں گے۔ سن لو کہ پھر فتنے ہوں گے۔ سن لو کہ پھر فتنے ہوں گے۔ بیٹھنے والا اس میں چلنے والے سے بہتر ہوگا۔ اور چلنے والا اس میں دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ سُن لو کہ جب ایسا ہو تو جس کے پاس اونٹ ہو تو وہ اپنے اونٹ سے مل جائے۔ جس کے پاس بکری ہو وہ اپنی بکری سے مل جائے۔ جس کے پاس زمین ہو وہ اپنی زمین سے مل جائے۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ اے خدا کے رسول، جس آدمی کے پاس نہ اونٹ ہو اور نہ بکری اور نہ زمین، وہ کیا کرے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ اپنی تلوار کو لے اوراس کی دھار کو پتھر پر مار کر سے توڑ ڈالے۔ پھر وہ اپنے آپ کو بچالے، اگر وہ بچنا چاہے۔ اے اللہ، کیا میں نے پہنچا دیا۔ یہ فقرہ آپ نے تین بار فرمایا:

سَمِعْتُ أَبَا بَكْرَةَ يُحَدِّثُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: إِنَّهَا سَتَكُونُ فِتَنٌ، أَلَا ثُمَّ تَكُونُ فِتْنَةٌ الْقَاعِدُ فِيهَا خَيْرٌ مِنَ الْمَاشِي فِيهَا، وَالْمَاشِي فِيهَا خَيْرٌ مِنَ السَّاعِي إِلَيْهَا، أَلَا فَإِذَا نَزَلَتْ أَوْ وَقَعَتْ فَمَنْ كَانَ لَهُ إِبِلٌ فَلْيَلْحَقْ بِإِبِلِهِ، وَمَنْ كَانَتْ لَهُ غَنَمٌ فَلْيَلْحَقْ بِغَنَمِهِ، وَمَنْ كَانَتْ لَهُ

أَرْضٌ فَلْيَلْحَقْ بِأَرْضِهِ. قَالَ: فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَرَأَيْتَ مَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ إِبِلٌ وَلَا غَنَمٌ وَلَا أَرْضٌ؟ قَالَ: يَعْمِدُ إِلَى سَيْفِهِ فَيَدُقُّ عَلَى حَدِّهِ بِحَجَرٍ، ثُمَّ لِيَنْجُ إِنِ اسْتَطَاعَ النَّجَاءَ، اللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ، اللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ، اللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2887)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی روایتیں کثرت سے منقول ہیں۔ ان کو حدیث کی کتابوں میں کتاب الفتن اور دوسرے ابواب کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ احادیث بتاتی ہیں کہ سیاسی بگاڑ کے زمانے میں عام مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی ٹکراؤ سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔ حکمراں افراد کے بگاڑ کے باجود انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ سیاسی اصلاح کے نام پر حکمرانوں سے لڑنا شروع کردیں۔

حدیث کے مطابق ایسے زمانے میں اہل ایمان کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنی بکری، اپنے اونٹ اور اپنی زمین کے ساتھ لگ جائیں اور اس کے اندر اپنا عمل جاری کردیں۔ یہ دراصل تمثیل کی زبان میں مسلمانوں کو ان کے عمل کا رخ بتایا گیا ہے۔ یعنی سیاسی ٹکراؤ کے دائرے کو چھوڑ کر اس غیر سیاسی دائرے میں اپنی کوششوں کو لگا دینا جہاں حکمرانوں سے ٹکراؤ کے بغیر اپنا عمل جاری رکھنا ممکن ہوتا ہے۔

تاہم ان ہدایات کا تعلق آغاز سفر سے ہے، منزل سے نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم حکومت میں بگاڑ دیکھو تو حکومت کے خلاف تحریک چلانے سے اپنے عمل کا آغاز نہ کرو، بلکہ غیر سیاسی میدانوں میں تعمیری جدوجہد سے اپنا عمل شروع کرو، اور پھر حسب حالات آگے کی طرف قدم اٹھاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے ایک طرف بعد کے مسلمانوں کو وہ ہدایات دیں

جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا عملی نمونہ بھی قائم کر دیا گیا۔ یہ نمونہ پیغمبر اسلام کے دونواسوں کے ذریعہ قائم کیا گیا۔ ایک حسنؓ بن علی، اور دوسرا حسینؓ بن علی۔ پہلا نمونہ اس بات کا کہ سیاسی ٹکراؤ کو چھوڑ کر اگر کام کیا جائے تو اس سے اسلام کو کس قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اور دوسرا نمونہ اس بات کا کہ اگر اصلاح سیاست کے نام پر حکمرانوں سے ٹکراؤ کیا جائے تو اس سے کس قسم کے نقصانات امت کے حصے میں آئیں گے۔

امام حسنؓ کا نمونہ

حضرت امام حسنؓ (50-3ھ) حضرت علی کی شہادت کے بعد خلیفہ بنائے گئے۔ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ امیر معاویہ شام اور دوسرے ملحق علاقوں کے حاکم تھے۔ وہ امام حسنؓ کی بیعت پر راضی نہیں ہوئے۔ جس طرح انہوں نے اس سے پہلے چوتھے خلیفہ حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام حسنؓ اور امیر معاویہ میں سخت کشیدگی ہوئی اور جنگ کے حالات پیدا ہو گئے۔

اس وقت امام حسنؓ کے ساتھ 40 ہزار آدمیوں کا لشکر تھا۔ دوسری طرف امیر معاویہ کے ساتھ بھی 40 ہزار یا اس سے کچھ زیادہ آدمیوں کا لشکر موجود تھا۔ امام حسنؓ 6 مہینہ تک خلافت کے عہدے پر رہے۔ مگر ان کی کوششوں کے باوجود امیر معاویہ ان کے ہاتھ پر بیعت کے لیے راضی نہ ہو سکے۔

امام حسنؓ نے محسوس کیا کہ اگر میں امیر معاویہ سے بیعت پر مزید اصرار کرتا ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہوگا جس میں دونوں طرف کے ہزاروں مسلمان مارے جائیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ یک طرفہ طور پر امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ امام حسنؓ کے ساتھیوں نے سخت اختلاف کیا اور انہیں معاویہ کے خلاف لڑنے پر

ابھارا۔ مگر وہ کسی قیمت پر لڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور 41ھ میں خلافت کو امیر معاویہ کے حوالے کر کے خانہ نشین ہو گئے۔

خلافت سے دستبرداری کے بعد امام حسنؓ نے مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا: اے مسلمانو، میں فتنہ کو بہت برا سمجھتا ہوں۔ میں نے مسلمانوں کی جان و مال کو بچانے کے لیے معاویہ بن ابی سفیان سے صلح کر لی ہے۔ اور ان کو امیر اور خلیفہ تسلیم کیا ہے۔ سنو، امارت اور خلافت اگر ان کا حق تھا تو وہ ان کو پہنچ گیا اور اگر وہ میرا حق تھا تو میں نے اس کو انہیں بخش دیا۔ (دیکھیے، الاستیعاب لابن عبد البر، جلد 1، صفحہ نمبر 389)

یہ صلح حضرت علی کی شہادت کے چھ ماہ بعد 41ھ میں کوفہ میں ہوئی۔ اسی لیے اسلام کی تاریخ میں 41ھ کو عام الجماعت کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس صلح نے مسلمانوں کے باہمی اختلاف کو باہمی اتحاد میں تبدیل کر دیا۔ اگرچہ اس وقت کے پرجوش لوگوں نے امام حسنؓ کی سخت مخالفت کی۔ حتیٰ کہ ان پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی اور ان کو عار المسلمین کا خطاب دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امام حسنؓ کا کارنامہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس کے بارے میں بہترین تبصرہ وہ ہے جو امیر معاویہ سے منقول ہے۔ انہوں نے امام حسنؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ابو محمد، تم نے آج ایسی بہادری اور جواں مردی دکھائی ہے جیسی بہادری اور جواں مردی اب تک کوئی بھی نہ دکھا سکا تھا۔

امام حسنؓ کی خلافت صرف چھ مہینے تک رہی۔ نیز یہ کہ وہ از خود خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ اس بنا پر مورخین عام طور پر ان کو خلافت راشدہ کی فہرست میں شامل نہیں کرتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلامی خلافت کی ایک شاندار سنہری کڑی ہیں۔

امام حسنؓ نے دس سال کی بھیانک خانہ جنگی کو ایک لمحہ میں ختم کر دیا۔ حضرت عثمان کے آخری دور اور ان کی شہادت (35ھ) سے لے کر حسنؓ اور معاویہ کے درمیان صلح (41ھ)

تک مسلم دنیا میں جو انتشار رہا، اس نے اسلام دشمنوں کو ریشہ دوانی کا زبردست موقع دے دیا تھا۔ یہ تمام سازشیں صلح کے بعد اچانک درہم برہم ہوگئیں۔ حضرت عثمان کی خلافت کے نصف حصے کے بعد اسلامی فتوحات کا سلسلہ رک گیا تھا، اب وہ دوبارہ جاری ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد مسلمانوں نے بحر روم کے جزیروں پر قبضہ کیا، طرابلس الغرب، مراکش، اسپین، سندھ، افغانستان، ترکستان وغیرہ فتح ہوئے۔ مسلمان پیش قدمی کر کے قسطنطنیہ کی دیواروں تک پہنچ گئے۔

امام حسنؓ کی صلح کا یہ بے حد اہم فائدہ ہوا کہ مسلمانوں کی تلواریں جو آپس میں ایک دوسرے کا خون بہا رہی تھیں، ان کا رخ باہر کی طرف ہو گیا۔ پوری مسلم دنیا اچانک ایک ناقابل تسخیر متحدہ طاقت بن گئی۔ اسلام کا سیلاب جس کو آپس کی لڑائیوں نے روک دیا تھا، وہ دوبارہ پوری طاقت کے ساتھ عالمی سطح پر رواں ہو گیا۔

امام حسینؓ کا نمونہ

امیر معاویہ نے اپنے لڑکے یزید بن معاویہ (64-65ھ) کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشیں بنا دیا تھا۔ تاہم امام حسینؓ نے یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ امام حسینؓ مدینہ سے مکہ چلے گئے۔ وہاں ان کے پاس کوفہ والوں کے خط آنے لگے جن میں درج ہوتا تھا کہ آپ کوفہ آجائیں ہم سب آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے۔ ہم آپ ہی کو خلافت کا حق دار سمجھتے ہیں۔ امام حسنؓ کو کوفہ والوں کے مزاج کا اندازہ تھا۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی امام حسینؓ کو پیشگی یہ وصیت کر دی تھی کہ کوفہ والے تم کو خروج پر ابھاریں گے۔ مگر تم کوفہ والوں کے فریب میں نہ آنا۔

مگر امام حسینؓ کوفہ والوں کی باتوں سے متاثر ہو گئے۔ انہوں نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو اپنا سیاسی نمائندہ بنا کر کوفہ بھیجا اور کہا کہ وہاں جا کر لوگوں سے ملو۔ اور پوشیدہ

طور پر میری طرف سے بیعت لو۔ کوفہ میں تقریباً 18 ہزار آدمیوں نے مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یزید کو پتہ چلا تو اس نے عبید اللہ بن زیاد کو ایک بڑی فوج کے ساتھ کوفہ روانہ کیا۔ اس نے کوفہ پہنچ کر مسلم بن عقیل کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا۔ بیعت کرنے والے دہشت زدہ ہو کر اپنی بیعت سے پھر گئے۔

3 ذی الحجہ 60ھ کو مسلم بن عقیل اور ان کے ساتھی کوفہ میں قتل کیے جا رہے تھے۔ عین اسی دن (3 ذی الحجہ کو) امام حسینؓ اس احساس کے ساتھ کوفہ کے لیے روانہ ہو رہے تھے کہ وہاں کے تمام مسلمان نیابتاً میرے لیے بیعت کر چکے ہیں۔ تمام صحابہ نے امام حسینؓ کو کوفہ کے سفر سے روکا۔ اس وقت ہزاروں کی تعداد میں صحابہ موجود تھے۔ مگر کوئی صحابی ان کے قافلے میں شریک نہ ہوا۔ اس کے باوجود وہ اپنی رائے پر مُصِر رہے اور اپنے اہل خانہ کو لے کر مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

امام حسینؓ کو مسلم بن عقیل کے قتل کی خبر صرف اس وقت ملی جب کہ وہ کوفہ کے قریب مقام ثعلبیہ پہنچ گئے۔ امام حسینؓ کا قافلہ جو تقریباً 70 آدمیوں پر مشتمل تھا، اس میں سخت مایوسی پھیل گئی۔ لوگ کہنے لگے کہ واپس چلو۔ مگر معلوم ہوا کہ یزید کے آدمیوں نے کوفہ کے چاروں طرف دور دور تک فوجیں مقرر کر دی ہیں کہ امام حسینؓ اگر واپس جانا چاہیں تو واپس نہ جا سکیں۔ چنانچہ امام حسینؓ واپسی کے لیے جس طرف بھی رخ کرتے، انہیں معلوم ہوتا کہ ایک فوج ان کو روکنے کے لیے وہاں موجود ہے۔

اس واقعے کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یزید کی فوجوں نے امام حسینؓ کے لیے لڑنے کے سوا کوئی اور راستہ باقی نہ رکھا۔ صحیح روایات کے مطابق، امام حسینؓ نے آخر وقت میں یزید کے آدمیوں سے کہا کہ میں تم سے تین میں سے کسی بھی ایک بات پر راضی ہوں۔ یا تو میں وہیں واپس چلا جاؤں جہاں سے میں آیا ہوں۔

یا میں اپنا ہاتھ یزید بن معاویہ کے ہاتھ پر رکھ دوں۔ یا مجھے مسلم سرحدوں میں سے کسی سرحد کی طرف جانے دو۔ اختاروا مني خصالا ثلاثا: إِمَّا أَنْ أَرْجِعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِي أَقْبَلْتُ مِنْهُ، وَإِمَّا أَنْ أَضَعَ يَدِي فِي يَدِ يَزِيدَ بْنِ مُعَاوِيَةَ فَيَرَى فِيمَا بَيْنِي وَبَيْنَهُ رَأْيَهُ، وَإِمَّا أَنْ تَسِيرُوا بِي إِلَى أَيِّ ثَغْرٍ مِنْ ثُغُورِ الْمُسْلِمِينَ شِئْتُمْ۔ (تاریخ الطبری، جلد 5، صفحہ 413)

مگر یزید کے فوجی تینوں میں سے کسی شرط پر راضی نہیں ہوئے۔ انہوں نے حملہ میں پہل کر کے امام حسینؓ کو لڑنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ دونوں گروہوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اس مقابلے میں اولاً امام حسینؓ کے تمام آدمی کام آئے۔ اور آخر میں خود امام حسینؓ بھی۔ امام حسینؓ بے حد طاقتور اور بہادر آدمی تھے۔ وہ نہایت بے جگری کے ساتھ لڑتے رہے۔ روایت کے مطابق ان کے جسم پر 33 نیزے کے زخم اور 43 تلوار کے زخم تھے۔ اس کے باوجود وہ شیر کی طرح مقابلہ کرتے رہے۔ آخر میں چند آدمیوں نے بیک وقت آپ پر حملہ کر کے آپ کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد آپ کا سر کاٹ کر جدا کیا گیا اور 12 سوار متعین کیے گئے جو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے دیر تک آپ کے جسم کو کچلتے رہے۔ پھر آپ کا سر یزید کے پاس دمشق روانہ کر دیا گیا۔ یزید نے جب آپ کا کٹا ہوا سر دیکھا تو وہ رو پڑا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو سخت سرزنش کی اور کہا کہ میں نے کب یہ حکم دیا تھا کہ تم حسینؓ بن علی کو قتل کر دو۔ آخر میں اس نے کہا: حسینؓ کی ماں میری ماں سے بہتر تھی۔ اور ان کے نانا تمام انسانوں سے بہتر تھے۔ مگر میرے اور حسینؓ کے درمیان خلافت کے مسئلہ پر نزاع ہوا۔ آخر اللہ نے اس کا فیصلہ ہمارے حق میں کر دیا۔

امام حسینؓ کے خروج کو اگر یہ حیثیت دی جائے کہ اس کا مقصد اصلاح سیاست تھا، یا یہ کہ وہ خاندانی خلافت کو ختم کر کے شورائی خلافت کا نظام قائم کرنا چاہتے تھے، تو بلا شبہ عملی

اعتبار سے ان کا اقدام مکمل طور پر نا کام رہا۔ کیوں کہ اس خروج سے نہ تو یزید کا خاتمہ ہوا اور نہ یزیدیت (خاندانی خلافت) کا۔ البتہ کچھ نہایت قیمتی زندگیاں بے فائدہ طور پر ضائع ہو گئیں حالاں کہ کسی اور میدان میں سرگرم ہو کر وہ بڑے بڑے اسلامی کارنامے انجام دے سکتی تھیں۔

دو عملی نمونے

یہ گویا دو رول ماڈل (نمونہ — عمل) ہیں۔ ایک حسنؓ بن علی کا، اور دوسرا حسینؓ بن علی کا۔ اوپر جو روایتیں نقل کی گئیں، وہ واضح طور پر ثابت کرتی ہیں کہ اسلامی طریق کار کے اعتبار سے صحیح رول ماڈل (role-model) وہ ہے جو حسنؓ بن علی کا ہے۔ اگر آدمی واقعی امر حق کا طالب ہو تو اس معاملے میں اس کو کوئی شبہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نام کی صراحت کے ساتھ حسنؓ بن علیؓ کے رول ماڈل کے حق میں اپنا پیشگی فیصلہ دے دیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر دیکھا اور حسنؓ بن علی آپ کے پہلو میں تھے۔ آپ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی حسنؓ کی طرف۔ اور فرماتے کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح قائم فرمائے گا:

إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ، وَلَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2557)

اس حدیث میں امام حسنؓ کے جس فعل کی تحسین ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے سیاسی نزاع کے میدان سے اپنے آپ کو ہٹا لیا۔ بخاری کی یہ روایت امام حسنؓ کے رول ماڈل کی پیغمبرانہ تصدیق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے امت مسلمہ کو ایک طرف واضح طور پر یہ بتا دیا کہ پیغمبر کے بعد اسلامی دنیا میں سیاسی بگاڑ آئے گا۔ حکمراں افراد ظلم کے راستے پر چلنے لگیں گے۔ مگر اس وقت کرنے کا کام یہ نہ ہوگا کہ امت کے علماء اور مصلحین حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ شروع کر دیں۔ اس کے برعکس انھیں یہ کرنا چاہیے کہ وہ براہ راست سیاسی ٹکراؤ سے الگ رہ کر دوسرے دینی اور تعمیری میدانوں میں اپنی کوششوں کو لگا دیں۔

اس سلسلے میں حدیث کی کتابوں میں کثرت سے روایتیں موجود ہیں۔ اس ہدایت کا مطلب فرار نہیں بلکہ حکمت ہے۔ اس سے مراد نتیجہ خیز (result-oriented) عمل پر زور دینا ہے۔ یعنی ایسے میدان میں اپنی کوشش صرف کی جائے جہاں کوشش کا مثبت نتیجہ بر آمد ہوتا ہو، ایسے میدان میں کوشش نہ کی جائے جہاں ساری کوشش صَرف کرنے کے بعد بھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو سکے۔

اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دوسرا انتظام یہ فرمایا کہ پیغمبر کے دو نواسوں کے ذریعے دونوں قسم کے عمل کی واضح مثالیں قائم کر دیں۔ نظری ہدایت کے ساتھ عملی طور پر بھی دکھا دیا کہ اگر تم سیاسی ٹکراؤ کرو گے تو اس کا نتیجہ کس شکل میں برآمد ہوگا۔

اوپر امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی جو متقابل مثالیں نقل کی گئیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت کے لیے دو تاریخی نمونے قائم کر دیے ہیں۔ امام حسنؓ کا نمونہ یہ بتاتا ہے کہ حکمرانوں سے ٹکراؤ نہ کرنے کی صورت میں اسلام اور مسلمانوں کو عظیم الشان فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، نمونہ امام حسینؓ کا ہے جو بتا رہا ہے کہ حکمرانوں سے ٹکراؤ کی سیاست سراسر ایک بے فائدہ عمل ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہ اسلام کے حصہ میں آنے والا ہے اور نہ مسلمانوں کے حصہ میں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو امت مسلمہ بنی، اس میں کچھ افراد وہ تھے جن کے اندر سیاسی حوصلہ تھا۔ وہ ملک گیری اور حکمرانوں سے ٹکراؤ کے راستہ پر چل پڑے۔ مگر ایسے لوگوں سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ کیوں کہ وہ اُمت محمدی کے نمائندہ افراد نہیں ہیں۔ اس وقت ہماری بحث کا تعلق امت کے صرف ان افراد سے ہے جن کو امت کے اندر نمائندہ حیثیت حاصل ہے، جو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی حقیقی تاریخ بنائی ہے۔

نمائندہ گروہ

واقعات بتاتے ہیں کہ امت کے نمائندہ طبقہ نے اللہ اور رسول کے مذکورہ منشا کو سمجھا۔ اور اس کو پوری طرح پکڑ لیا۔ اس کے بعد امت کی تاریخ اسی رخ پر چل پڑی۔ اور ہزار برس تک مسلسل اسی رخ پر چلتی رہی۔ موجودہ زمانے کی نام نہاد اسلامی انقلابی تحریکوں سے پہلے اس کی خلاف ورزی کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کا پہلا نمائندہ طبقہ وہ ہے جس کو صحابۂ کرام کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علماء، صوفیاء کا درجہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو امت میں نمائندہ گروہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سے کسی بھی گروہ نے کبھی مذکورہ بالا ہدایت کے خلاف روش اختیار نہیں کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تمام لوگ حسنؓ کے رول ماڈل پر چلتے رہے، نہ کہ حسینؓ کے رول ماڈل پر۔

بنوامیہ کے زمانے میں جب امت کے سیاسی ادارے میں بگاڑ پیدا ہوا تو ہزاروں کی تعداد میں صحابہ موجود تھے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ انہوں نے سیاسی بگاڑ کے خلاف اس قسم کا کوئی ہنگامہ نہیں کھڑا کیا جس کا نمونہ موجودہ زمانے کی نام نہاد اسلامی جماعتوں نے پیش کیا ہے۔

اس کے برعکس، انھوں نے یہ کیا کہ وہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں پھیل گئے۔ اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام کرنے لگے۔ اسی کا نتیجہ وہ جغرافی واقعہ ہے جس کو عرب دنیا کہا جاتا ہے۔ صحابہ کی انہیں "غیر سیاسی" کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام نہ صرف عرب کے چاروں طرف پھیلا بلکہ ایک وسیع خطے میں اسلام کو ابدی طور پر تہذیبی غلبہ حاصل ہو گیا۔

صحابۂ کرام اگر "سیاسی اصلاح" کے نام پر حکمرانوں سے ٹکراتے تو یقینی تھا کہ ان کا انجام وہی ہوتا جو امام حسینؓ کا اور ان کے ساتھیوں کا کربلا کے میدان میں ہوا۔ ایسی حالت میں زمین پر ایک وسیع دنیائے کربلا تو ظہور میں آسکتی تھی مگر یہ ناممکن تھا کہ ایک وسیع دنیائے اسلام ظہور میں آئے۔

تابعین اور تبع تابعین کی ایک بڑی تعداد نے بھی ایسا ہی کیا۔ ان کے زمانے میں حکمرانوں کا بگاڑ پوری طرح ظاہر ہو چکا تھا مگر انہوں نے حکمرانوں سے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر حدیث کی تدوین کا کام شروع کر دیا۔ انہوں نے وہ فن تخلیق کیا جس کو علم حدیث کہا جاتا ہے۔

دوسری طرف انہوں نے رات دن کی محنت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حدیثوں کو جمع کیا اور ان کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا تاکہ وہ قیامت تک کی نسلوں کے لیے رہنمائی کا کام کرتا رہے۔

محدثین کا گروہ اس کے بجائے اگر یہ کام کرتا کہ وہ اسلامی سیاست کے نام پر حکمرانوں سے لڑائی شروع کر دیتا تو حدیث کی تدوین کا کام انجام نہیں پا سکتا تھا۔ یہ بلاشبہ اتنا بڑا نقصان ہوتا جس کی تلافی قیامت تک نہ ہو سکے۔

انہیں تابعین اور تبع تابعین کا ایک گروہ وہ ہے جو فقہ کی تدوین میں لگ گیا۔ انہوں نے کتاب وسنت کے نصوص میں قیاس اور اجتہاد کے ذریعے بے شمار احکام مستنبط کیے۔

انہوں نے نہ صرف علم فقہ کو وجود دیا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کے لیے مکمل قانونی نظام مرتب کر دیا۔

یہ فقہاء اگر اپنے زمانے کے "ظالم" حکمرانوں سے اصلاح کے نام پر جنگ اور ٹکراؤ شروع کر دیتے تو فقہ کی تدوین کا وہ عظیم الشان کام انجام نہیں پا سکتا تھا جو ان حضرات کے ذریعہ انجام پایا۔

اس کے بعد علماء کا وہ طویل سلسلہ ہے جو صدیوں کے درمیان اسلام کی علمی اور تعمیری خدمت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان حضرات نے بھی یہی کیا کہ حکمرانوں کے بگاڑ کے خلاف سیاسی تحریک چلانے کا طریقہ چھوڑ کر دوسرے ممکن میدانوں میں سرگرم ہو گئے۔ اسی کا ایک نتیجہ وہ عظیم الشان علمی سرمایہ ہے جس کو اسلامی کتب خانہ کہا جاتا ہے۔ آج ہمارے پاس عربی زبان میں تفسیر حدیث، سیرت، تاریخ اسلام، علم کلام، فقہ اور دوسرے اسلامی موضوعات پر بے شمار نہایت قیمتی کتابیں موجود ہیں۔ وہ اسلام کے علمی مطالعے کے لیے ابدی طور پر کافی ہیں۔ تاہم یہ ناقابل بیان حد تک قیمتی کام اسی وقت ممکن ہو سکا جب کہ علماء اسلام نے سیاسی تصادم کو چھوڑ کر پر امن تعمیری میدان کو اپنی کوششوں کا مرکز ومحور بنایا۔

یہی معاملہ صوفیاء کا بھی ہے۔ صوفیاء کے زمانے میں بھی ہر طرف ظالم حکمراں موجود تھے۔ مگر صوفیاء نے ان سے براہ راست ٹکراؤ نہیں کیا۔ وہ ان حکمرانوں سے الگ رہ کر خالص غیر سیاسی دائرہ میں سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے "اصلاح سیاست" کے بجائے "اصلاح افراد" کو اپنا نشانہ بنایا۔

صوفیاء اگر حکمرانوں سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرتے تو اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا کہ ان میں سے ہر ایک کے نام کے ساتھ لفظ شہید کا اضافہ ہو جائے جیسا کہ موجودہ زمانہ کے بہت سے رہنماؤں کی مثال میں نظر آتا ہے۔ مگر جب انہوں نے سیاست گاہ کے بجائے خانقاہ کو

اپنا مرکزعمل بنایا تو وہ لاکھوں لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بن گئے حتیٰ کہ خود حکمرانوں کی اصلاح کا ذریعہ بھی۔

انہیں صوفیاء کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ آج برصغیر ہند میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان پائے جاتے ہیں۔ بھارت کے علاوہ، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلم ملک زیادہ تر صوفیاء ہی کی بدولت وجود میں آئے ہیں۔ حکمرانوں سے ٹکراؤ کرنے والوں کے ذریعہ کبھی اس قسم کا مثبت واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔

ہندستان میں جو صوفیاء گزرے ہیں، ان کے حالات اور ان کے ملفوظات کو پڑھیے تو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے ملک کے غیر مسلموں میں براہ راست تبلیغ کا کام کیا ہو۔ یا اس کا پروگرام بنایا ہو، اس کے باوجود یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ہندستان کے لاکھوں بلکہ کروڑوں غیر مسلم ہیں جنہوں نے انہیں صوفیاء کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔

حضرت خالد بن ولید کو تبلیغ کے لیے یمن میں بھیجا گیا۔ وہ وہاں پہنچے تو وہ اونٹ پر بیٹھ کر لوگوں کے درمیان بلند آواز سے کہتے پھرتے تھے کہ: ایھا الناس قولوا لاالہ الا اللہ تفلحوا (لوگو، لا الہ الا اللہ کہو، تم کامیاب ہو گے)۔ صوفیاء کے متعلق ثابت نہیں کہ وہ اس طرح لوگوں کے درمیان تبلیغ کی کوشش کرتے ہوں۔ اصل یہ ہے کہ لوگ بطور خود اسلام کی طرف مائل ہوتے تھے اور اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ پھر جب وہ اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو وہ اپنے علاقے کے کسی مسلمان بزرگ کے پاس آتے اور ان سے کہتے کہ ہم کو اسلام میں داخل کر لیجیے۔ اس طرح صوفیاء بالواسطہ طور پر اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بنے۔

ایک اہم سبق

صوفیاء کی مذکورہ تاریخ نے بالواسطہ انداز میں ایک عظیم الشان کام انجام دیا ہے۔ اس نے اسلام کی دعوتی طاقت کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ اس تاریخ سے یہ ثابت ہوا

ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان اگر نفرت اور کشیدگی کی فضا کو ختم کر دیا جائے تو اسلام اپنے آپ پھیلنے لگتا ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ ایک مسلّمہ مذہب ہے۔ وہ تاریخی طور پر ثابت شدہ دین بن چکا ہے۔ اور جب ایک مذہب اس طرح ایک مسلّمہ حقیقت بن جائے تو اس کے اندر اپنے آپ پھیلنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانی فطرت سے موافقت کا زور ہی اس بات کے لیے کافی ہو جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنانے لگے۔ اب اس کی راہ کی رکاوٹ صرف یہ ہوتی ہے کہ مدعو اقوام کے درمیان اسلام سے بیزاری اور نفرت کی فضا پیدا ہو گئی ہو۔ اگر ایسی فضا نہ ہو تو لوگ خود اپنی اندرونی آواز کے زیر اثر اس کی طرف مائل ہوں گے۔ اور اپنے آپ اسے قبول کر لیں گے۔

اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ صوفیاء اس حقیقت کا شعوری ادراک رکھتے ہوں۔ تاہم ان کے عمل کا یہ فائدہ یقیناً اسلام کو حاصل ہوا۔ صوفیاء کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ وہ محبت اور امن کا پیغام لے کر اٹھے۔ چشتیہ سلسلہ کی کتاب نافع السالکین میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے طریقہ میں یہ ہے کہ مسلمان اور ہندو دونوں سے صلح رکھنی چاہیے (در طریق ما ہست کہ با مسلمان و ہندو صلح باید داشت) اسی طرح شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ نوّاں یہ کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ صلح رکھی جائے (تاسعاً آنکہ صلح با ہندو و مسلمان سازند)۔ اپنے اسی مسلک کی بنا پر صوفی حضرات دوسروں پر تنقید نہیں کرتے تھے، وہ دوسرے راستوں کے خلاف تنقید کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

صوفیاء نے اسی انداز پر کام کیا۔ انہوں نے اپنے مسلسل عمل سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کشیدگی کی فضا ختم کر دی۔ اس کا دعوتی فائدہ براہ راست اسلام کے حصے میں آیا۔

صوفیاء کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مذہب وملت کی تمیز کیے بغیر ہر ایک کو امن اور محبت کا

پیغام دیتے تھے۔ وہ اپنے تمام معاملات میں ہمیشہ رواداری کا طریقہ برتتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی درگاہ میں جو لنگر تیار کیا جاتا تھا، وہ بھی "ویجیٹیرین" ہوتا تھا، تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر اس کے کھانے میں شریک ہوسکیں۔

ہندستان کے اسلامی سیاست دانوں کے نظریہ کو اگر مختصر طور پر بیان کرنا ہو تو اس کو علامہ اقبال کے اس شعر میں بیان کیا جاسکتا ہے:

مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ   مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ

صوفیاء حضرات کا نظریہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ جنگ کے بجائے صلح کا تھا۔ ایک فارسی شاعر نے صوفیاء کے نظریۂ حیات کو چند لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے:

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

صوفیاء کے نظریۂ حیات کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لیے ان کے ملفوظات اور ان کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہاں ہم مختصر طور پر دو قصے نقل کریں گے جس سے صوفیاء کے طریق کار کا اندازہ ہوتا ہے۔

خواجہ فرید الدین گنج شکر مشہور بزرگ ہیں۔ وہ 12 ویں صدی عیسوی (چھٹی صدی ہجری) سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا ایک مرید ان کے پاس قینچی لے کر آیا۔ اس کے شہر میں قینچیاں بنتی تھیں۔ اس لیے اس نے شیخ کے تحفہ کے لیے قینچی کا انتخاب کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب میں شیخ کے سامنے اپنے شہر کا یہ خصوصی تحفہ پیش کروں گا تو وہ خوش ہوں گے اور مجھے دعائیں دیں گے۔ مگر جب اس نے شیخ کے سامنے قینچی پیش کی تو انھوں نے اس کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو ہمارے کام کی چیز نہیں۔ ہمارا کام کاٹنا نہیں، ہمارا کام تو جوڑنا ہے۔ اور یہ کام قینچی کے ذریعے نہیں ہوتا۔ تم کو اگر تحفہ لانا تھا تو ہمارے لیے سوئی لے آتے۔ کیوں کہ سوئی سینے اور جوڑنے کی چیز ہے، اور قینچی کاٹنے اور پھاڑنے کی چیز۔

خواجہ فرید الدین کے ہم عصر اور خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء تھے۔ انہوں نے اپنی مجلس میں فرمایا کہ عام لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ سیدھے کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھے کے ساتھ ٹیڑھا۔ لیکن ہمارے بزرگ کا یہ کہنا ہے کہ سیدھوں کے ساتھ سیدھا، اور ٹیڑھوں کے ساتھ بھی سیدھا۔ اگر کوئی شخص ہمارے سامنے کانٹا ڈالے اور ہم بھی کانٹا ڈالیں تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔ اگر کسی نے کانٹا ڈالا ہے تو تم اس کے سامنے پھول ڈالو۔ پھر پھول ہی پھول ہو جائیں گے۔

اسلام کی طاقت

صوفیاء بطور خود تو پیغام محبت لے کر اٹھے تھے۔ مگر ان کا پیغام محبت بالواسطہ طور پر پیغام دعوت بن گیا۔ انہوں نے اپنی طرف سے محبت اور امن کی فضا بنائی۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ لوگ ضد اور تعصب کے بغیر اسلام کو دیکھنے لگے۔ وہ اس قابل ہو گئے کہ جب وہ اسلام کا مطالعہ کریں یا مسلمانوں سے تعلقات کے دوران جب اسلام کی کوئی بات سامنے آئے تو معتدل ذہن کے ساتھ اس پر سوچ سکیں۔ صوفیاء کے پیدا کردہ ماحول نے لوگوں کے درمیان اور اسلام کے درمیان ہر قسم کی نفسیاتی رکاوٹ کو ختم کر دیا۔ جب ایسا ہوا تو لوگ کثرت سے اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ انہوں نے جوق در جوق اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

آج بھی یہی تاریخ دہرائی جا سکتی ہے، بشرطیکہ مسلمان صوفیاء کی تاریخ کو دہرانے کے لیے تیار ہوں۔ وہ داعی اور مدعو کے درمیان یکطرفہ طور پر نفرت اور کشیدگی کی فضا کو ختم کر کے دوبارہ وہ معتدل ماحول بنائیں جب کہ لوگ کسی توحش کے بغیر اسلام کو دیکھیں اور اس کو اپنے دل کی آواز پا کر اسے اختیار کر لیں۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی مدعو قوموں سے اسلام کے نام پر بے شمار جھگڑے چھیڑے ہوئے ہیں۔ ان جھگڑوں نے مدعو قوموں کے اندر اسلام کے

خلاف نفرت اور بیزاری کی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ یہی فضا اسلام کی اشاعت میں اصل رکاوٹ ہے۔ مسلمان اگر یہ تمام جھگڑے یکطرفہ طور پر ختم کر دیں تو فوراً دونوں کے درمیان معتدل فضا قائم ہو جائے گی۔ لوگ جوق در جوق اسلام کی طرف راغب ہونے لگیں گے۔

غیر مسلم اقوام میں اسلام کی اشاعت کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ تلخی اور بیزاری کی موجودہ فضا کو ختم کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر صرف اتنا کریں کہ وہ کچھ نہ کریں تب بھی وہ بہت بڑا کام کریں گے، وہ اسلام کی اشاعت کا سیلاب جاری کر دیں گے جو آج ان کی کارروائیوں ہی کی وجہ سے رک گیا ہے اور جو داعی اور مدعو کے درمیان کشیدگی کو بڑھا کر معتدل فضا کو ختم کیے ہوئے ہے۔

ایک جائزہ

پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت شدت کے ساتھ بار بار یہ ہدایت دی تھی کہ اگر تم حکمرانوں میں سیاسی بگاڑ دیکھو تو ہرگز ان سے ٹکراؤ نہ کرو، بلکہ اپنے ممکن مواقع کے دائرے میں اپنی جدو جہد جاری رکھو۔

اپنے ممکن دائرے میں جدو جہد کرنا عمل ہے اور حکمرانوں سے ٹکرانا ردّ عمل۔ اور اسلام اپنے تعمیری اور دعوتی مزاج کی بنا پر عمل کا طریقہ پسند کرتا ہے۔ اس کو ردّ عمل سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کا اثر نہ صرف علماء اور عوام پر گہرا تھا بلکہ اس نے خود حکمرانوں کو بھی کافی متاثر کیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ تقریباً ہزار سال تک اسلام کی ترقی بلا انقطاع جاری رہی۔ ترقی اور اشاعت کا یہ غیر معمولی سلسلہ صرف موجودہ زمانے میں اس وقت رکا ہے جب کہ پُر جوش اسلام پسندوں نے اس حکمِ نبوی کی خلاف ورزی شروع کر دی۔

حکمرانوں پر اثر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کرنے کا یہ نتیجہ تھا کہ بعد کے دور میں اگرچہ "خلیفہ" کی جگہ "سلطان" ہونے لگے، مگر جو کچھ بگاڑ آیا وہ محدود معنوں میں صرف سیاسی تھا اور شاہی محلوں کے دائرہ تک محدود رہا۔ عمومی سطح پر مسلم معاشرہ میں بدستور اسلامی زندگی کا تسلسل جاری رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک ہزار سال تک مسلم معاشرہ کسی بڑی خرابی سے پاک رہا۔ مزید یہ کہ اسی عمومی اصلاح کا یہ نتیجہ تھا کہ خود سلاطین اور حکمراں کا بگاڑ بھی ایک حد کے اندر باقی رہا، وہ حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد پورے ہزار سالہ دور میں علماء اور مصلحین بادشاہوں پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے، وہ ان کے بہت سے احکام کو سرے سے نظر انداز کرتے تھے۔ اس کے باوجود کسی بادشاہ یا حکمراں کو یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ ان کے خلاف کوئی جابرانہ کارروائی کرسکے۔

حضرت عبداللہ بن عمر یزید بن معاویہ کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے آخر وقت تک یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ مگر یزید کو یہ ہمت نہ ہوسکی کہ وہ عبداللہ بن عمر سے جبری بیعت لے یا ان کو قتل کرادے۔ ہارون الرشید کے ایک معاصر بزرگ نے خلیفہ سے مصافحہ کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہارون الرشید نے رونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ہاتھ کتنے نرم ہیں، کاش وہ جہنم کی آگ سے بھی محفوظ رہ سکیں۔ اس سخت کلام کے باوجود خلیفہ نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اسپین کا سلطان عبدالرحمن الناصر جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے قرطبہ کی جامع مسجد میں گیا۔ وہاں جامع مسجد کے خطیب نے جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے علی الاعلان سلطان پر تنقید کی۔ مگر سلطان کو یہ ہمت نہ ہوسکی کہ وہ انہیں خطیب کے عہدہ سے معزول کردے یا ان کی سزا کا فرمان جاری کرے۔

القول الجلی (صفحہ 162) میں بتایا گیا ہے کہ امام ابن تیمیہ قازان کے دربار میں داخل ہوئے جو ایک مسلم سلطان تھا۔ اس نے کھانا پیش کیا۔ دوسرے لوگوں نے اس کو کھایا مگر ابن تیمیہ نے نہیں کھایا۔ قازان نے پوچھا کہ آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا۔ ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ میں کیسے تمہارا کھانا کھاؤں جب کہ وہ لوگوں کے اموال کو چھین کر تیار کیا گیا ہے اور غصب کیے ہوئے درخت کی لکڑیوں پر اس کو پکایا گیا ہے۔ وغیرہ۔

ابن تیمیہ کے ساتھی کہتے ہیں کہ جب ابن تیمیہ قازان کے سامنے اس قسم کی تقریر کر رہے تھے تو ان کی بے باکی کو دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ اب وہ ضرور قتل کر دیے جائیں

گے۔ چنانچہ ہم اپنے کپڑے سمیٹنے لگے اس خوف سے کہ وہ قتل کیے جائیں اور ہمارے کپڑے ان کے خون سے آلودہ ہو جائیں: وَنَحْنُ نَجْمَعُ ثِيَابَنَا خَوْفًا أَنْ يَقْتُلَ فَيُطَرْطِسُ بِدَمِهِ۔ مسالک الآبصار رلابن فضل اللہ العمری، جلد 5، صفحہ 699)

اس غیر معمولی بے باکی کے باوجود قازان کو یہ جرأت نہ ہوسکی کہ وہ ابن تیمیہ کے خلاف ہاتھ اٹھائے۔

مغل شہنشاہ جہانگیر کا واقعہ ہے جس کو مولانا شبلی نعمانی نے نہایت موثر انداز میں نظم کیا ہے اور وہ "عدل جہانگیری" کے عنوان سے ان کے مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ اس واقعے کے مطابق جہانگیری کی محبوب ملکہ نور جہاں نے ایک شخص کو بلا سبب طپنچہ مار کر قتل کر دیا۔ یہ معاملہ شرعی مفتی کے سامنے پیش ہوا۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں:

مفتی شرع نے بے خوف وخطر صاف کہا   شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن

مفتی کے اس فتوے کے بعد نور جہاں، جہانگیر اور تمام درباری اپنے کو بے دست و پا محسوس کرنے لگے۔ بظاہر اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ مقتول کے قصاص میں نور جہاں کو قتل کر دیا جائے۔ آخر کار مقتول کے ورثاء دیت لینے پر راضی ہو گئے اور اس طرح نور جہاں کی جان بچ گئی۔

اسلام کی پچھلی ہزار سالہ تاریخ میں اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جو کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ عام طور پر لوگ ان واقعات کو بعض افراد کے خانے میں ڈالے ہوئے ہیں، مگر زیادہ صحیح طور پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ اس طریقہ کے خانے میں جاتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یعنی حکمرانوں سے ٹکراؤ چھوڑ کر عوامی سطح پر اسلام کی تعلیمات کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنا۔ بعد کے دور کے علماء اور اہل دین اگر اپنے ہم عصر بادشاہوں کو تخت سے بے دخل کرنے کے لیے ان سے سیاسی ٹکراؤ کرتے تو مسلم ملکوں کا وہی انجام ہوتا جو

موجودہ زمانے میں، مثال کے طور پر، مصر اور پاکستان میں نظر آتا ہے۔ ان ملکوں میں اینٹی حکمراں سیاست کے نتیجے میں بربادی اور تخریب کاری کے سوا کسی اور چیز کی تاریخ نہ بن سکی۔ جب کہ اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کرنے کی وجہ سے ایک ہزار سال تک اسلام کی تعمیر اور اس کی اشاعت کا کام نہایت طاقت ورانداز میں جاری رہا۔

سیاسی بدعت

امام حسینؓ کے واحد استثناء کو چھوڑ کر پوری اسلامی تاریخ امام حسنؓ کے نمونۂ عمل (رول ماڈل) پر چلتی رہی۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علماء، صوفیاء وغیرہ جو امت کے نمائندہ گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ سب کے سب ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک اسی روش پر چلتے رہے۔

موجودہ زمانے میں بھی امت کا نمائندہ طبقہ بڑی حد تک اسی روش پر قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مسجد اور مدرسہ کو بنیاد بنا کر دینی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یا علمی اداروں اور دینی تنظیموں کی صورت میں انہوں نے غیر سیاسی دائرے میں اپنے لیے دینی کام تلاش کر لیے ہیں اور ان میں وہ یکسوئی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ حدیث کے الفاظ میں، ہر ایک اپنے "اونٹ" اور پانی" بکری" سے وابستہ ہو کر خدمت دین میں مصروف ہے۔ یہ لوگ امت کو کچھ دے رہے ہیں۔ جب کہ اسلامی سیاست داں صرف یہ کر رہے ہیں کہ جو کچھ امت کو حاصل ہے، اس سے اسے محروم کر دیں۔

بیسویں صدی کے وسط سے امت مسلمہ کے اندر ایک نیا مظہر پیدا ہوتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ تمام مسلم ممالک مغرب کے سیاسی قبضے سے آزاد ہو گئے۔ اس وقت چھوٹے بڑے تقریباً 50 مسلم ملک دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی ملکوں میں ایسی تحریک ابھری ہے جو اس سے پہلے کبھی مسلم دنیا میں نہیں پائی گئی

تھی۔ یہ وہی ہے جس کو "اسلامی سیاست" کی تحریک کہا جاتا ہے۔

ان تحریکوں سے وابستہ افراد اپنے ملک کے حکمرانوں سے اس عنوان پر لڑ رہے ہیں کہ انہوں نے ملک میں اسلامی قانون نافذ نہیں کیا۔ وہ موجودہ حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹا کر دوسرے افراد لانا چاہتے ہیں جو ان کے خیال کے مطابق اسلامی قانون کا نظام قائم کرسکیں گے۔

یہ گویا ایک اعتبار سے، امام حسینؓ کے رول ماڈل کو زندہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ تاہم امام حسینؓ میں اور موجودہ اسلامی لیڈروں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ امام حسینؓ صرف لڑے تھے، جب کہ موجودہ اسلامی لیڈر اپنی لڑائی کو ایک مستقل فلسفہ یا قرآن وحدیث کی ایک نئی سیاسی تعبیر بنا کر پیش کررہے ہیں۔ اس طرح موجودہ اسلامی لیڈروں کا معاملہ بہت زیادہ سنگین معاملہ بن جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ نہ صرف یہ کہ ایک ممنوعہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے اپنی ممنوعہ لڑائی کو درست ثابت کرنے کے لیے قرآن کی ایک خودساختہ تعبیر بھی کرڈالی ہے جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے معنوی تحریف کے ہم معنی ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تعبیر کی غلطی")

اجماعِ امت

اسلام کے اصولوں میں سے ایک مستقل اصول یہ ہے کہ اہلُ الامر (ارباب حکومت) سے نزاع نہ کی جائے، حتی کہ اس وقت بھی نہیں، جب کہ بظاہر وہ غلط نظر آتے ہیں۔ اس حکم کا مقصد اصلاح کا جذبہ رکھنے والوں کی توجہ کو سیاست سے موڑ کر غیر سیاسی میدانوں میں تعمیر کی طرف لگانا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر سلف سے خلف تک امت کا اجماع ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی (مدیر جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض) نے 22-18 اپریل 1987ء کو جامعۃ الازھر، قاہرہ کی کانفرنس میں ایک مقالہ پیش کیا تھا۔

اس کا عنوان تھا: منهج الدعوة الى الله۔ اس مقالے میں انہوں نے سلف صالحین کے عقیدے کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا، اس مقالے کا ایک حصہ یہ ہے:

وَلَا نَرَى الخُرُوجَ عَلَى أَئِمَّتِنَا وَوُلَاةِ أُمُورِنَا وَإِنْ جَارُوا، وَظَلَمُوا وَلَا نَدْعُو عَلَيْهِمْ، وَلَا نَنْزِعُ يَدًا مِنْ طَاعَتِهِمْ، وَنَرَى طَاعَتَهُمْ مِنْ طَاعَةِ اللّٰهِ عز وجل فَرِيضَةً، الِاسْتِحْضَار الدَائِمِ لِمَنْهَجِ إَهْلِ السُّنَّةِ فِى هٰذِهِ النُّقْطَةِ وَهِىَ: إَلَّا يُنَازِعَ الدُّعَاةُ الْأَمْرَ إَهْلَه۔(صوت الامة، بنارس رجب 1408ھ، صفحہ 23-15) یعنی اور ہم اپنے سربراہ ہوں اور حاکموں کے خلاف بغاوت کو صحیح نہیں سمجھتے، خواہ وہ ظلم اور زیادتی کریں۔ اور ہم ان کے خلاف بددعا نہیں کرتے۔ اور ہم ان کی اطاعت سے دست کش نہیں ہوتے۔ اور ہم ان کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ فرض سمجھتے ہیں۔ اہل سنت کے طریقہ کے اس پہلو کا مستقل استحضار رہنا چاہیے کہ داعی کبھی بھی اہل امر سے نزاع نہ کرے۔

ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی نے اوپر کی سطروں میں جو بات کہی ہے، وہ اہل سنت کے طریقے کی نہایت صحیح ترجمانی ہے۔ ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے سے اہل سنت کا یہی اجماعی مسلک ہے کہ داعی اور مصلح غیر سیاسی دائرے میں دعوت اور اصلاح کا کام کرے۔ وہ اربابِ حکومت کو تخت سے بے دخل کرنے کو ہرگز اپنی جدو جہد کا نشانہ نہ بنائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ داعی اور مصلح کے لیے ہر دور میں صحیح رول ماڈل امام حسنؓ کا ہے، نہ کہ امام حسینؓ کا۔

ناقص استدلال

موجودہ زمانے میں جن لوگوں نے دین کی سیاسی تعبیر کی ہے، ان میں سے ایک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ ان کی تنظیم جماعت اسلامی، اور مصر کی الاخوان المسلمون، دونوں

اپنے اپنے علاقے میں اپنے حکمرانوں کے خلاف سیاسی جہاد میں مشغول ہیں۔ یہ عین وہی عمل ہے جس کو قدیم اصطلاح میں خروج کہا جاتا تھا، یعنی سیاسی بگاڑ کو درست کرنے کے نام پر حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلانا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس فکر کے ممتاز وکیل سمجھے جاتے ہیں۔ وہ کس طرح اس سیاسی انحراف کی توجیہ کرتے ہیں، اس سلسلے میں یہاں ان کی تحریروں کے دو اقتباس نقل کیے جاتے ہیں۔

تفہیم القرآن میں سورہ الحجرات (آیت 9) کے تحت انہوں نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ ان لوگوں کی شرعی حیثیت کیا ہے جو ایک ایسی حکومت کے خلاف خروج کریں جو ان کی نظر میں ظالم حکومت ہو "جس کی امارت (ان کے خیال کے مطابق) جبراً قائم ہوئی ہو۔ اور جس کے امراء فاسق ہوں۔ اور خروج کرنے والے (اپنے اعلان کے مطابق) عدل اور حدود اللہ کی اقامت کے لیے اٹھے ہوں۔ اور ان کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ وہ صالح لوگ ہیں۔ اس صورت میں ان کو باغی، یعنی زیادتی کرنے والا گروہ قرار دینے اور اس کے خلاف جنگ کو واجب قرار دینے میں فقہاء کے درمیان سخت اختلاف واقع ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ جمہور فقہاء اور اہل الحدیث کی رائے یہ ہے کہ جس امیر کی امارت ایک دفعہ قائم ہو چکی ہو، اور مملکت کا امن وامان اور نظم ونسق اس کے انتظام میں چل رہا ہو، وہ خواہ عادل ہو یا ظالم، اور اس کی امارت خواہ کسی طور پر قائم ہوئی ہو، اس کے خلاف خروج کرنا حرام ہے، الّا یہ کہ وہ کفرِ صریح کا ارتکاب کرے۔ امام سرخسی لکھتے ہیں کہ جب مسلمان ایک فرماں روا پر مجتمع ہوں اور اس کی بدولت ان کو امن حاصل ہو اور راستے محفوظ ہوں۔ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ اس کے خلاف خروج کرے تو جو شخص بھی جنگ کی طاقت رکھتا ہو اس پر واجب ہے کہ مسلمانوں کے اس فرماں روا کے ساتھ مل کر

خروج کرنے والوں کے خلاف جنگ کرے۔ امام نووی شرح مسلم میں کہتے ہیں کہ ائمہ، یعنی مسلمان فرماں رواؤں کے خلاف خروج اور قتال حرام ہے، خواہ وہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہوں، اس پر امام نووی اجماع کا دعویٰ کرتے ہیں ("تفہیم القرآن، حصہ پنجم، صفحہ 80-79)

مذکورہ اقتباس اپنی تردید آپ ہے۔ اس میں صاحب مضمون ایک طرف یہ اقرار کر رہے ہیں کہ "جمہور فقہاء اور اہل الحدیث" کی رائے یہ ہے کہ قائم شدہ مسلم حکومت کے خلاف خروج کرنا حرام ہے۔ دوسری طرف اسی عبارت میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس بارے میں "فقہاء کے درمیان سخت اختلاف واقع ہو گیا ہے۔"

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کیوں کہ جس فعل کو "جمہور فقہاء" حرام قرار دے رہے ہوں، اسی کے بارے میں فقہاء کے درمیان "سخت اختلاف" کیسے واقع ہو جائے گا۔ ایک ہی عبارت میں اس قسم کا متضاد بیان ظاہر کرتا ہے کہ مصنف اس معاملے میں اپنے آپ کو بے دلیل محسوس کر رہے ہیں۔ اس لیے بوکھلاہٹ میں وہ ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں۔ جو خود ہی ایک دوسرے کی تردید ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مذکورہ عبارت کے بعد بعض فقہاء اور علماء کی رائیں پیش کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے نزدیک بگڑے ہوئے مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج کرنا جائز بلکہ ضروری ہے۔ مگر تقریباً چار صفحہ کی یہ پوری بحث سراسر ناقص اور غیر علمی ہے۔

مثلاً اس میں سیاسی تنقید کے جواز کو سیاسی بغاوت کے جواز کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ دونوں کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔ لفظی تنقید، حسن نیت کی شرط کے ساتھ، کسی بھی شخص کے بارے میں کی جا سکتی ہے۔ مگر کسی کے خلاف عملی اقدام کی اس طرح آزادانہ اجازت نہیں۔

امام ابوحنیفہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ظالم امراء کے خلاف قتال کو نہ صرف

جائز سمجھتے تھے، بلکہ اس قسم کے قتال کو اہل کفر کے خلاف جہاد سے بھی زیادہ افضل قرار دیتے تھے۔ یہ بلاشبہ ایک لغو بات ہے۔ خود مولانا مودودی کے بیان کے مطابق، امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں مسلم سلاطین میں ظلم و جبر آچکا تھا۔ مگر امام ابوحنیفہ نے ان کے خلاف کبھی قتال نہیں کیا۔ ان کے ممتاز شاگرد امام ابو یوسف نے انہیں حکمرانوں کے تحت قضا کا سرکاری عہدہ قبول کرلیا۔ پھر کیا امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف بزدل اور مصلحت پرست تھے۔ کیا ان کا قول کچھ تھا اور ان کا عمل کچھ۔

اسی طرح اس بحث میں غیر متعلق باتوں کو اپنے نظریہ کی دلیل بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ حضرت علی نے "جنگ جمل میں فتح یاب ہونے کے بعد اعلان کیا کہ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کرو، زخمی پر حملہ نہ کرو، گرفتار ہوجانے والوں کو قتل نہ کرو، جو ہتھیار ڈال دے اس کو امان دو، لوگوں کے گھروں میں نہ گھسو، اور عورتوں پر دست درازی نہ کرو، خواہ وہ تمہیں گالیاں ہی کیوں نہ دے رہی ہوں۔ آپ کی فوج کے بعض لوگوں نے مطالبہ کیا کہ مخالفین کو اور ان کے بال بچوں کو غلام بنا کر تقسیم کردیا جائے۔ اس پر غضب ناک ہو کر آپ نے فرمایا، تم میں سے کون ام المؤمنین عائشہ کو اپنے حصے میں لینا چاہتا ہے؟" (صفحہ 82-81)

اس طرح کے اقوال اور احکام کو مولانا مودودی نے بظاہر مسلک بغاوت کا جواز ثابت کرنے کے لیے نقل کیا ہے۔ حالانکہ ان اقوال اور احکام کا اس قسم کے مسلک سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تمام حوالے "حکمراں کیا کرے" کے مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں، نہ کہ "باغی کیا کریں" کے مسئلے سے۔

یہ اقوال و احکام حکمراں کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت کو جائز قرار نہیں دیتے۔ وہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ جب کچھ مسلمان اپنی نادانی یا سرکشی سے مسلم حکمراں کے خلاف

بغاوت کا اقدام کر بیٹھیں تو حکمراں کو چاہیے کہ وہ ان کے ساتھ اسلامی شرافت والا معاملہ کرے۔ وہ ان کے ساتھ عام دشمنوں جیسا سلوک نہ کرے، جیسا کہ ام المؤمنین عائشہ کے بارے میں حضرت علی کے قول سے واضح ہو رہا ہے۔

نمونہ کا مسئلہ

ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی ایک تقریر نمایاں طور پر شایع کی گئی ہے جو انہوں نے 10 جون 1962ء کو لاہور میں کی تھی اور ان کی زندگی ہی وہ اخبار ایشیاء لاہور، 12 جون 1962 میں چھپی تھی۔ اس مطبوعہ تقریر کا عنوان یہ ہے: حضرت حسینؓ سے نمونہ لیجیے ۔اس تقریر کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"اگر حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور غیر اسلامی طریقے سے چلائی جا رہی ہو تو مسلمانوں کو سخت اُلجھن پیش آتی ہے۔قوم مسلمان ہے،حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے مگر چلائی جا رہی ہے غیر اسلامی طریقے پر،تو اس حالت میں ایک مسلمان کیا کرے۔اگر حضرت حسینؓ ان حالات میں نمونہ پیش نہ کرتے تو کوئی صورت رہنمائی کی نہ تھی۔اگر کسی مسلمان حکومت کا بگاڑ جزئیات میں ہے تو نظم ونسق درہم برہم کرنے کی کوشش روا نہ ہوگی، مگر جب بادشاہ یا خلیفہ نے اس حکومت کو موروثی بنانے کی کوشش کی تو اصولی تغیر واقع ہو گیا۔ایک خاندان نے حکومت کو اپنی جائیداد بنانے کا فیصلہ کرلیا تو انہوں نے اس کے روکنے کا فیصلہ کرلیا۔خواہ اس میں ان کی جان جائے اور ان کا بچہ بچہ کٹ جائے۔حضرت حسینؓ نے یہ نمونہ پیش کیا کہ اگر حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور وہ غلط راہ پر جا رہی ہو تو اس کے خلاف جدو جہد درست ہے۔یہ حضرت حسینؓ ہی کا نمونہ تو ہے جو مسلمان حکومت کے بگاڑ کے وقت مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔اگر اس نمونے کو بھی چھوڑ دیا جائے تو نمونہ کہاں سے آئے گا۔معاملہ صرف یہ نہیں کہ جگر گوشۂ رسولؐ کو قتل کر دیا گیا اور ہم نوحہ خوانی کے لیے

بیٹھے ہیں، بلکہ نمونہ حاصل کرنے کا ہے۔"(ترجمان القرآن، ستمبر 1987)۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے یہ تقریر اپنی اس سیاست کے جواز میں کی ہے جو انہوں نے پاکستان کے قیام (1947) کے بعد پاکستان میں چلائی اور جس پر وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک قائم رہے۔ یعنی پاکستان کے مسلم حکمرانوں کو "غیر صالح" قرار دے کران کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلانا اور اس میں ہر وہ طریقہ اختیار کرنا جو موجودہ زمانے کی سیاسی جماعتیں اختیار کرتی ہیں۔

اس تقریر میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی یہ اقرار کر رہے ہیں کہ ان کی نام نہاد اسلامی سیاست کی تبریر (justification) کے لیے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل میں نمونہ ہے اور نہ ایک لاکھ سے زیادہ صحابۂ کرام کی زندگیوں میں۔ ان کے لیے نمونہ نہ تابعین میں ہے اور نہ تبع تابعین میں، نہ محدثین میں ہے اور نہ فقہاء میں۔ نہ علماء میں ہے اور نہ صوفیاء میں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معیاری دور سے لے کر 1400 برس تک اٹھنے والے اکابر امت میں ان کے لیے نمونہ نہیں۔ ان کے لیے اگر نمونہ ہے تو صرف ایک نوجوان حسینؓ ابن علی میں جس کے اقدام کو علماء اُمت نے متفقہ طور پر اجتہادی خطا قرار دیا ہے۔

صاحب تقریر کا یہ یقین اس کے باوجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث میں امام حسینؓ کے اس سیاسی عمل کی تائید موجود نہیں۔ ان کے ہم عصر ہزاروں اصحاب رسول میں سے کوئی ایک صحابی بھی اس معاملے میں ان سے متفق نہ تھا۔ بعد کی تاریخ میں امت کے کسی بھی نمائندہ طبقے نے ان کے عمل کو اپنے لیے نمونہ نہیں بنایا۔ حتیٰ کہ خالص تاریخی اعتبار سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ خود امام حسینؓ کا اقدام فی الواقع وہی نوعیت رکھتا تھا جو مولانا مودودی جیسے لوگ آج ہم کو بتا رہے ہیں۔

ان تمام غیر موافق پہلوؤں کے باوجود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو یہ اصرار ہے کہ وہ امام

حسینؓ کے نمونے کو اپنے لیے نمونہ بنائیں گے۔ اگر کسی طرزِ عمل کو دینی اور شرعی ثابت کرنے کے لیے مذکورہ بالا دلیل کافی ہو تو مجھے معلوم نہیں کہ اس دنیا میں کون سا عمل اور کون سی روش ایسی ہے جس کو دینی اور شرعی اعتبار سے جائز اور ضروری ثابت نہ کیا جا سکے۔

موجودہ زمانے کا تجربہ

موجودہ زمانے میں، نتائج کے اعتبار سے، دوبارہ وہی دو مختلف مثالیں قائم ہوئی ہیں جن کے نمونے اسلام کی ابتدائی تاریخ میں حسنین کے ذریعے سامنے آئے تھے۔

جن مسلم رہنماؤں نے حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ کو نشانہ بنا کر کام کیا، وہ امت کی تاریخ میں بربادی اور محرومی کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر سکے۔ اس کی واضح مثالیں مصر اور پاکستان میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مصر میں الاخوان المسلمون کے لوگ اس بات کے چیمپین بنے تھے کہ حکومت پر قبضہ کر کے ملک کے اندر اسلامی سماج کی تشکیل کریں۔ مگر تقریباً نصف صدی کی ہنگامہ خیز کوشش کے بعد معلوم ہوا کہ یہ طریقِ کار گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ وہ سراسر ناکام رہا۔

امریکہ سے مسلمانوں کا ایک انگریزی جرنل نکلتا ہے جس کا نام اسلامک سوشل سائنسز ہے۔ اس کے شمارہ ستمبر 1987ء میں سوڈان کے اخوانی لیڈر ڈاکٹر حسن ترابی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ریاست، اسلام کا صرف ایک سیاسی اظہار ہے۔ آپ ایک اسلامی ریاست نہیں بنا سکتے جب تک آپ نے ایک اسلامی معاشرہ نہ بنایا ہو:

> “The state is only the political expression of an Islamic society. You cannot have an Islamic state insofar as you have an Islamic society.” (p. 1)

اس کے برعکس، مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے سیاست سے الگ رہ کر دوسرے اصلاحی میدانوں میں اپنی کوششیں صرف کیں۔ ان سے امت کو واضح قسم کے مثبت فائدے حاصل ہوئے۔ اس کی ایک مثال تبلیغی جماعت ہے۔ تبلیغی جماعت سے امت کو مسلّمہ طور پر دینی فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ بلاشبہ یہی ہے کہ اس جماعت نے حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ کو اپنا نشانہ نہیں بنایا، بلکہ اپنی تمام سرگرمیاں یکسوئی کے ساتھ غیر سیاسی دائرے میں مُرتکز کردیں۔

ناکامی کا اعتراف

الاخوان المسلمون 1928ء میں قائم ہوئی۔ 1938ء میں اس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ بہت جلد اس کے اثرات اکثر عرب ملکوں میں پھیل گئے۔ اس جماعت کا فکر یہ تھا کہ حکومت کا ادارہ سب سے زیادہ طاقت ور ادارہ ہے۔ وہی سماج کی صورت گری کرتا ہے۔ اس لیے سماج کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کے ادارے پر قبضہ کیا جائے۔

اس تحریک کے زیر اثر اس کے افراد مختلف عرب ملکوں کی حکومتوں سے ٹکرا گئے۔ انہوں نے حکمراں افراد کو اقتدار سے بے دخل کرنے میں ساری طاقت لگا دی۔ یہی کام پاکستان میں وہاں کے اسلام پسندوں کے ذریعہ 1947ء میں شروع ہوا جو آج تک برابر جاری ہے۔ مگر پچھلی نصف صدی کی کوششوں کے نتائج مکمل طور پر برعکس صورت میں برآمد ہوئے ہیں۔ ان حضرات کی کوششوں نے مسلم معاشروں کے فساد اور بربادی میں تو ضرور اضافہ کیا مگر وہ ان کو تعمیر اور اصلاح کی طرف لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مزید یہ کہ ان ہنگامہ خیز کوششوں کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ مصر اور پاکستان دونوں جگہ سیکولر افراد حکومت کے شعبوں پر قابض ہیں، اور اسلام پسندوں کا اقتدار میں کوئی حصہ نہیں۔

ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی کے جس مقالے کا اوپر حوالہ دیا گیا، اس میں موصوف نے بجا طور پر کہا ہے کہ معاشرہ چھلانگ کے ذریعہ نہیں بدلتا، اس کو صرف تدریج کے ذریعہ بدلا جا سکتا ہے: إِنَّ الْمُجْتَمَعَاتِ لَا تَتَغَيَّرُ بِالطَّفْرَةِ بَلْ بِالتَّدْرِيْجِ۔ (صوت الامۃ، بنارس رجب 1408ھ، صفحہ 21)

اصل یہ ہے کہ صالح حکمراں صالح معاشرہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب بھی حکمراں میں بگاڑ نظر آئے تو مصلحین کو معاشرے کی اصلاح میں سرگرم ہو جانا چاہیے۔ کیوں کہ صالح معاشرے کی زمین ہی سے صالح حکمراں برآمد ہوگا۔ ایسی حالت میں حکمراں سے سیاسی جنگ شروع کرنا صرف حالات کو مزید بگاڑنے کے ہم معنی ہے۔

اس کی زندہ مثال پاکستان ہے۔ پاکستان جن علاقوں پر مشتمل ہے۔ اس کے باشندوں کی دینی و اخلاقی حالت 1947ء سے پہلے اس سے بہتر تھی جو آج وہاں پائی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں کے اسلام پسند رہنما، حکمرانوں کے خلاف سیاسی لڑائی لڑنے میں مشغول ہو گئے۔ اس لڑائی میں وہ یہاں تک گئے کہ انہوں نے تمام روایتیں توڑ ڈالیں۔ مثلاً سیاسی قتل، سطحی مظاہرے، عوام پسند نعرے، سیاسی پارٹیوں والے ہتھکنڈے، ناجائز کو جائز اور جائز کو ناجائز کرنا (مثلاً فاطمہ جناح کی صدارت) اسلامائزیشن کے نام پر کوڑے اور پھانسی کی سیاست، وغیرہ۔

ان چیزوں کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ پاکستان کے عوام کو اسلام سے اور علماء سے نفرت ہو گئی۔ 45 سالہ اسلامی سیاست کے بعد نومبر 1988ء میں جب عوام کو آزادانہ انتخاب کا موقع ملا تو پہلے ہی الیکشن میں انہوں نے اسلام پسندوں کو ہرا کر سیکولر لیڈروں کو کامیاب کر دیا۔

موجودہ زمانے میں نام نہاد اسلامی سیاست کی ناکامی، بلکہ اس کا الٹا نتیجہ برآمد ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جس کو خود اس حلقہ کے سنجیدہ لوگ اب تسلیم کر رہے ہیں۔ اس کی ایک

مثال اخوانی رہنما ڈاکٹر حسن ترابی کا وہ مقالہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

یہ بات جو ان رہنماؤں کو اب معلوم ہوئی ہے، وہ انہیں نصف صدی کے ناکام تجربے سے پہلے ہی معلوم ہوسکتی تھی۔ بشرطیکہ انہوں نے سنّتِ رسول کا گہرا مطالعہ کر کے اپنی تحریک شروع کی ہوتی۔ الاخوان المسلمون (اور اسی طرح پاکستان کی اسلام پسند جماعت) کا آغاز بطور ردّعمل ہوا۔ اپنے قریبی سیاسی حالات سے متاثر ہو کر وہ حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس کے برعکس، اگر وہ ایسا کرتے کہ تحریک شروع کرنے سے پہلے سنّتِ رسول کا گہرا مطالعہ کرتے تو وہ اس معاملے میں اصل حقیقت کو اوّل دن ہی پا سکتے تھے۔ اس کے بعد ان کی تحریک صحیح اسلامی رخ پر چلتی، اور بالآخر صحیح اسلامی انجام تک پہنچتی۔

نوآبادیاتی زمانہ

انیسویں صدی کا نصف ثانی اور بیسویں صدی کا نصف اول مسلمانوں کے لیے بے حد اہم زمانہ ہے۔ عمومی طور پر ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے اور خصوصی طور پر برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لیے یہ سوسال گویا تشکیل ذہن کے سوسال ہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مسلمانوں کی سیاسی طاقت کمزور ہوئی اور ان کی حکومتیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر مغربی قوموں کے قبضے میں چلی گئیں۔ اس وقت مسلمانوں میں سیاسی مصلحین اُٹھے۔ جمال الدین افغانی (1897-1838) سے لے کر ابو الکلام آزاد (1958-1888) تک ہزاروں چھوٹے بڑے رہنما ہیں جو اس دور میں نمایاں ہوئے۔ ان لوگوں کی ساری توجہ مسلم اقتدار کے دَور کو واپس لانے پر لگی ہوئی تھی۔ ان کی تمام کوششوں کا واحد مرکز یہ تھا کہ مغربی غلبہ ختم ہو اور مسلمانوں کا غلبہ دوبارہ لوٹ آئے۔

اس نوعیت کے کام کے لیے جہاد و قتال کی باتیں زیادہ موزوں تھیں۔ چنانچہ تمام

رہنماؤں پر کامل طور پر یہی ذہن چھایا رہا۔اس نوعیت کے کام کے لیے امام حسنؓ کا رول ماڈل موزوں نہ تھا۔ بلکہ امام حسینؓ کا رول ماڈل موزوں تھا۔یہی وجہ ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اسلامی تاریخ میں پہلی بار حسینؓ کے رول ماڈل کو مبالغہ آمیز طور پر نمایاں کرنے کا کام کیا گیا۔حسینؓ کے کردار کو اتنا زیادہ گلوریفائی کیا گیا کہ وہ ہر دوسری چیز پر چھا گیا۔اس پوری مدت میں حسنؓ کے رول ماڈل پر، میرے علم کے مطابق، کوئی ایک بھی قابل ذکر کتاب یا مضمون شایع نہ ہوسکا۔جب کہ اسی مدت میں حسینؓ کے رول ماڈل پر بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں کتابیں، مضامین اور اشعار لکھے گئے۔حسینؓ کو ایک خیالی ہیرو کے روپ میں پیش کیا گیا جس کا تاریخی حسینؓ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس عمل پر اب کئی نسلیں بیت چکی ہیں۔حتیٰ کہ مسلمانوں کی موجودہ پوری نسل حسینؓ کے رول ماڈل کے سحر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ہر آدمی ہر وقت لڑنے کے لیے تیار رہتا ہے۔وہ اپنی بے معنی لڑائی کو جہاد اور بے معنی موت کو شہادت سے کم نہیں سمجھتا۔کسی شاعر کا یہ شعر موجودہ مسلمانوں کی نفسیات کے بارے میں نہایت صحیح ہے:

گھیر لیتا ہے جب ان کو باطل کہیں — دل کے اندر سے کہتا ہے کوئی بزن

موجودہ مسلم نسل کے ذہن کے اس بگاڑ کی ذمہ داری موجودہ دور کے تمام مسلم رہنماؤں پر ہے جنہوں نے مفروضہ ”شہادتِ کُبریٰ“ کو اس قدر گلوریفائی کیا کہ مسلمانوں کے سامنے اب اس کے سوا اور کوئی فکر یا اور کوئی رول ماڈل باقی ہی نہ رہا جس پر وہ سوچیں اور جس پر عمل کرنے کے لیے ان کے اندر تڑپ پیدا ہو۔

میدان عمل کا مسئلہ

موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اس راز کو نہیں جانا کہ ایک میدان میں مواقع کار چھن جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر اعتبار سے کام کا موقع چھن گیا۔زندگی اس سے

زیادہ وسیع ہے کہ کوئی شخص اس کی حد بندی کرسکے۔ چنانچہ جب کسی شخص یا قوم کے لیے ایک میدان میں عمل کے دروازے بند ہوتے ہیں تو عین اسی وقت کسی اور میدان میں اس کے لیے عمل کے شاندار دروازے کھل جاتے ہیں۔ دانش مند وہ ہے جو بند دروازے پر اپنا سر نہ پٹکے، بلکہ جو دروازہ کھلا ہوا ہے، اس کو استعمال کرکے آگے بڑھ جائے۔ اس معاملے کو سمجھنے کے لیے یہاں جاپان کی مثال درج کی جاتی ہے۔

جاپان کی مثال

دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپانی ایک عسکری قوم (militarist people) کی حیثیت رکھتے تھے۔ 1945ء میں جاپان امریکی فوج کے مقابلے میں ہار گیا۔ اس کے بعد جنرل میک آرتھر (Douglas Mac Arthur) کو جاپان کا سپریم کمانڈر بنایا گیا۔ وہ 1945ء سے 1951ء تک جاپان کے فوجی حکمراں رہے۔

امریکی پالیسی کے تحت میک آرتھر کا خاص مشن یہ تھا کہ جاپان کی فوجی طاقت کو توڑیں اور اس کی عسکریت کو ختم کریں۔ اس مقصد کے لیے میک آرتھر نے وہ تدبیر اختیار کی جس کو رخ پھیرنا (diversion) کہا جاتا ہے۔ یعنی جاپانیوں کو سیاسی ٹکراؤ سے ہٹا کر تعلیم اور صنعت کے میدان میں سرگرم کرنا۔ جاپان میں جنرل میک آرتھر کے مقصد کو، ایک جملہ میں، اس طرح بیان کیا گیا ہے — اس جنگجو قوم کے جذبۂ عمل کو عسکریت سے ہٹا کر معاشی میدان میں سرگرم کرنا:

> “To channel the drive of this aggressive people away from militarism and into economic ambition.”

اب جاپان کے لیے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ میک آرتھر کے منصوبے کو ”امریکی سازش“ قرار دے کر اس کے خلاف احتجاج اور ٹکراؤ کا منفی عمل شروع کردے۔ دوسرے یہ کہ وہ پیش آمدہ صورت حال کو مان لے اور اس کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے لیے نیا

مستقبل بنانے کی کوشش کرے۔ جاپان نے پہلے طریقے کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

جنگ کے بعد کی چالیس سالہ تاریخ بتاتی ہے کہ جاپان کی پالیسی نہایت کامیاب رہی۔ جاپان اگر ٹکراؤ کے راستے پر چلتا تو اس کے بعد یہ ہوتا کہ امریکہ سے دوبارہ لڑائی چھڑ جاتی۔ جاپان کے بچے ہوئے وسائل بھی برباد ہو جاتے۔ مگر جب اس نے امریکی منصوبے سے موافقت کر لیا تو اس کو امریکہ سے زبردست تعاون ملا۔ وہ امریکہ کی "چھتری" کے نیچے صنعتی ترقی کرنے لگا۔ اس طریقے پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان نے نصف صدی سے کم عرصے میں پہلے سے بھی زیادہ بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ حتیٰ کہ خود فاتح امریکہ کو اپنے مقابلے میں بالآخر دفاعی حیثیت میں ڈال دیا۔

موجودہ دنیا میں یہی زندگی اور ترقی کا راز ہے۔ یہاں دشمن کی تخریبی سازشوں میں اپنے لیے تعمیری پہلو دریافت کرنا پڑتا ہے۔ یہاں اغیار کے مخالفانہ منصوبوں کو اپنے موافق زینے کے طور پر استعمال کرنا ہوتا ہے۔ جو لوگ اس دانش مندی کا ثبوت دیں، وہی امتحان کی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس برتر عقل کا ثبوت نہ دے سکیں، ان کے لیے اس دنیا میں ناکامی اور بربادی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

فوج سے زیادہ طاقت ور

دوسری عالمی جنگ کے بعد نومبر 1946ء میں جاپان کا جو نیا دستور بنا اس کے مصنف امریکی جنرل ڈگلس میک آرتھر تھے۔ انہوں نے اس دستور کے دفعہ 9 کے تحت جاپان کو ہمیشہ کے لیے اس بات کا پابند کر دیا تھا کہ وہ کبھی بھی زمینی، برّی یا ہوائی فوج نہیں رکھے گا۔ اور نہ کسی قسم کی دوسری جنگی تیاری کرے گا:

> "Land. sea, and air forces, as well as other war Potential, will never be maintained." (*Encyclopedia Britannica,* 10/87)

امریکی ساخت کے جاپانی دستور کی اس دفعہ میں جنگی امکان (war potential) کا لفظ بے حد سبق آموز ہے۔ اس کے تحت جاپان کو نہ صرف معروف معنوں میں جنگی طاقت بننے سے روک دیا گیا تھا بلکہ اس کو ایسی سرگرمیوں سے بھی منع کر دیا گیا تھا جو اپنے اندر کسی نوعیت کا کوئی جنگی امکان رکھتی ہوں۔ مگر تقریباً نصف صدی کی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان بہت کم جانتا ہے۔ اس کی معلومات حقائق کی وسعتوں کے لحاظ سے بہت تھوڑی ہے۔

جاپان کو جنگی ہتھیاروں کی تیاری سے روک دیا گیا تھا، مگر جاپان کے لیے اب بھی ایک وسیع میدان کھلا ہوا تھا۔ یہ معاشی اور اقتصادی سرگرمیوں کا میدان تھا۔ امریکی حکمراں جاپان کو جنگی ہتھیار بنانے سے روک سکتے تھے۔ مگر ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ جاپان کو اقتصادی سرگرمیوں سے بھی روک دیں۔ جاپان سیاسی ٹکراؤ کا راستہ چھوڑ کر اقتصادیات کے میدان میں سرگرم ہو گیا۔ یہاں تک کہ نصف صدی سے بھی کم عرصے میں اس نے خود اس تاریخ کو بدل دیا جس کے تحت امریکی حکمرانوں نے جاپان سے اس کی ابدی شکست پر دستخط لیے تھے۔

امریکی میگزین ٹائم (24 اپریل 1989ء) میں صفحہ 33-32 پر ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جاپان موجودہ صدی کے آخر میں اقتصادی دیو (economic giant) بن کر ابھرا ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جاپان کی صنعت کے مقابلے میں امریکہ مسلسل دفاعی پوزیشن میں چلا جا رہا ہے۔ اور اس کی خاص وجہ امریکہ کے اوپر جاپان کا بڑھتا ہوا صنعتی دباؤ ہے۔

اولاً امریکہ کی مارکیٹ پر جاپان کے ٹیلی ویژن نے قبضہ کیا۔ امریکہ کے ٹیلیویژن مینوفیکچرر جاپان کے اقتصادی حملہ کا پہلا شکار تھے۔ اس کے بعد جاپانی کاروں نے امریکہ کی سڑکوں پر قبضہ کیا۔ حالیہ برسوں میں جاپانی کمپیوٹر امریکی کمپیوٹر کے مقابلے میں فائق تر ثابت

ہوا ہے۔ اور اب مستقبل قریب میں جاپان کی یہی صنعتی فوقیت ہوائی جہاز بنانے کے میدان میں ظاہر ہونے والی ہے۔

عوامی رائے (polls) کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ موجودہ امریکی سوویت یونین کی فوجی طاقت سے زیادہ جاپان کی اقتصادیات سے خوف زدہ ہیں:

"Mindful of polls showing that many Americans are more fearful of Japan's economy than of the Soviet Union's military strength."

روس کی مثال

تاریخ میں اس نوعیت کی دوسری مثالیں بھی موجود ہیں جب کہ امن کی طاقت جنگ کی طاقت سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ پرامن ذرائع نے وہ کام انجام دے دیا جو جنگی ذرائع سے بھی انجام نہیں پا سکتا تھا۔ پوری تاریخ میں اس تدبیر کی سب سے زیادہ شاندار مثال وہ ہے جو رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے ساتویں صدی عیسوی میں پیش آئی۔ (اس کی تفصیل کتاب "دین کامل" میں دیکھی جا سکتی ہے) یہاں ہم بیسویں صدی کی ایک اور مثال درج کرتے ہیں۔

18 ویں صدی میں وہ شہنشاہیت وجود میں آئی جس کو عام طور پر برطانیہ عظمیٰ (Great Britain) کہا جاتا ہے۔ روس ایک عظیم سرحدی ملک کی حیثیت سے ہمیشہ برطانیہ کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ پہلے اس ملک میں زار کی سلطنت قائم تھی۔ 191ء میں کمیونسٹ انقلاب آیا اور روس نے سوویت روس کی شکل اختیار کر لی۔

پہلی عالمی جنگ (1914-18) کے دوران کمیونسٹ پارٹی کو موقع ملا کہ وہ حالات کی ابتری کو استعمال کر کے روس میں اپنا نفوذ حاصل کر سکے۔ کمیونسٹ نظریات تیزی سے روسی باشندوں میں پھیلنے لگے۔ وہ زار کے "ظالمانہ" نظام کے مقابلے میں اشتراکی نظام کو اپنے

لیے زیادہ بہتر سمجھنے لگے۔

یہ صورت حال برطانیہ کے لیے اس کی سلطنت کے مشرقی حصہ میں ایک خطرہ کے ہم معنی تھی۔ چنانچہ نومبر 1918ء میں انگریز فوجی افسروں کا ایک وفد سمرقند بھیجا گیا تا کہ وہ تازہ صورت حال کا جائزہ لے کر اس کے بارے میں رپورٹ پیش کرے۔ یہ ایک خفیہ وفد تھا۔ چنانچہ ظاہری طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ: ایک تجارتی وفد ہے اور وسط ایشیا کی کپاس کا سودا کرنے جارہا ہے۔ وفد کے ممبران یہ تھے:

کرنل بیلی (F.M. Bailey)

کرنل ایتھرٹن (P.T. Etherton)

میجر بلیکر (L.V.S. Blacker)

اس وفد نے روسی علاقے میں پہنچ کر اس مقصد کے تحت وہاں کا جائزہ لیا جس کے لیے وہ بھیجا گیا تھا۔ واپسی کے بعد کرنل ایتھرٹن نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا— وسط ایشیا کے قلب میں:

"In the Heart of Central Asia"

مصنف نے اپنی کتاب میں جو باتیں لکھیں، ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ بالشویکوں (کمیونسٹوں) کے نئے نظریات جن کو لے کر وہ بڑھ رہے ہیں، وہ بالقوہ طور پر مشرق میں انگریزی غلبے کے لیے اس سے زیادہ بڑا خطرہ ہیں جتنا کہ ماضی میں شہنشاہ زار کی تمام فوجیں ہوسکتی تھیں:

"The new set of ideas of the Bolsheviks was potentially much more of a menace to English domination in the Orient than all the Czar's armies in the past." (pp. 92-93)

بیسویں صدی کے آغاز میں شہنشاہ زار کے پاس ہر قسم کی فوجی طاقت تھی۔ اس کے

مقابلے میں کمیونسٹوں کے پاس صرف ایک غیر فوجی طاقت تھی۔ اور وہ ان کا نظریہ تھا۔ روس میں دونوں طاقتوں (فوج اور نظریہ) کے درمیان مقابلہ پیش آیا۔ اس مقابلے میں فوجی طاقت کے حاملین کو شکست ہوئی اور جو لوگ نظریے کی طاقت لے کر آگے بڑھے تھے، وہ کامیاب ہو گئے۔ یہ واقعہ روس میں اکتوبر 1917ء میں پیش آیا۔

مذکورہ واقعہ اسلامی طریق کار کی صداقت کی ایک عصری تصدیق ہے۔ اسلام کا اعتماد سب سے زیادہ اپنی نظریاتی طاقت پر ہے۔ اسلامی تحریک اپنی نظریاتی طاقت کے زور پر آگے بڑھتی ہے۔ اسلام اپنے نظریے کے ذریعے ہر دوسری چیز پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ اسلام کی تاریخ اس کی نمایاں مثال ہے۔ مذکورہ حوالہ اسی اسلامی صداقت کی گویا ایک عصری تائید وتوثیق ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی جدید تاریخ

اسی سے ملتی جلتی صورتِ حال ہندستان میں 1857ء کے بعد پیش آئی جب کہ انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے باقاعدہ منصوبے کے تحت یہ کوشش کی کہ اس ملک کے باشندوں کو سیاسی ٹکراؤ کے راستے سے ہٹا کر تعلیم اور تبلیغ کے میدان میں مصروفِ عمل کردیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے ہر قسم کا تعاون پیش کیا۔

ہندو قوم نے انگریز کے اس منصوبے کو فوراً قبول کرلیا۔ وہ بہت بڑے پیمانے پر انگریزی تعلیم کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے انگریزوں کے تعاون سے بے شمار تعداد میں اسکول اور کالج بنائے اور تقریباً اپنی پوری نسل کو اس راہ میں ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ آج سامنے ہے۔ ہندو، بحیثیت قوم، مسلمانوں کے مقابلے میں کم از کم ایک سو سال تعلیم میں آگے ہیں۔ اس ملک میں ہندوؤں کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب ان کا تعلیمی تقدم ہے، اور مسلمانوں کی بربادی کا سب سے بڑا سبب ان کی تعلیمی پسماندگی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں ناقابل فہم حد تک نادان ثابت ہوئے۔ ان کی جھوٹی برتری کا احساس ان کے لیے مذکورہ جاپانی طریقے کو اختیار کرنے میں مانع بن گیا۔ انہوں نے کامل بے سروسامانی ، اور اسی کے ساتھ کامل بے خبری کے باوجود، انگریزوں سے ایک ایسی بے معنی جنگ شروع کردی جس کا سارا فائدہ انگریزوں کے حق میں جانے والا تھا اور جس کا سارا نقصان خود مسلمانوں کے حق میں۔

انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں کے ساتھ عین وہی تدبیر اختیار کرنا چاہا جو دوسری عالمی جنگ کے بعد میک آرتھر نے جاپانیوں کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ یعنی مسلمانوں کی توجہ سیاسی ٹکراؤ سے ہٹا کر تعلیم اور تبلیغ کی طرف موڑ دینا۔ مگر مسلمان بحیثیت قوم اس ہوش مندی کا ثبوت نہ دے سکے جس کا ثبوت خود اس ملک میں ہندوؤں نے اور جاپان میں زیادہ بڑے پیمانے پر جاپانیوں نے دیا تھا۔ اس بات کی وضاحت کے لیے یہاں میں صرف دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔

قدیم ایم اے او کالج (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں ایک انگریز پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ تھے۔ انہوں نے 500 صفحات پر مشتمل ایک انگریزی کتاب لکھی جس کا نام دعوتِ اسلام (The Preaching of Islam) تھا۔ یہ کتاب پہلی بار 1896ء میں چھپی۔ اس کتاب میں دکھایا گیا تھا کہ اسلام کی اصل طاقت دعوت ہے۔ اسلام اپنی پوری تاریخ میں دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے پھیلا ہے۔ اپنی دعوتی طاقت سے وہ ہر ظالم کے مقابلے میں کامیاب رہا ہے۔ اور ہر فاتح کے مقابلے میں دوبارہ اس نے غلبہ حاصل کیا ہے۔

ذاتی طور پر میں اس کتاب کو ایک بے حد قیمتی کتاب سمجھتا ہوں۔ تاہم 19 ویں صدی کے آخر میں جب یہ کتاب چھپی تو عام طور پر مسلم رہنماؤں نے اس کے بارے میں کہا کہ یہ کتاب انگریزی سازش کے تحت لکھی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی

جہاد کے میدان سے ہٹا دیا جائے۔

مولانا حمید الدین فراہی (1863-1930) پروفیسر آرنلڈ کے زمانے میں علی گڑھ کالج میں موجود تھے۔ ان کے شاگردِ خاص مولانا امین احسن اصلاحی مولانا موصوف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مولانا حمید الدین فراہی جس زمانے میں علی گڑھ میں بی اے کے طالب علم تھے اس زمانے میں علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر مشہور انگریز مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ تھے۔مولانا نے ان سے فلسفے کا درس لیا۔مگر وہ ان سے خوش نہیں تھے۔ وہ آرنلڈ صاحب کو بھی اسی بساط سیاست کا ایک مہرہ سمجھتے تھے جو انگریزوں نے علی گڑھ میں بچھا رکھی تھی۔علی گڑھ کا حلقہ ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام کا بڑا مداح تھا۔لیکن مولانا حمید الدین فراہی اس کتاب کے سخت مخالف تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے اندر سے روحِ جہاد ختم کرنے کے لیے لکھی گئی ہے (تفاسیر فراہی)۔

آرنلڈ کی کتاب (پریچنگ آف اسلام) کے بارے میں اس قسم کے تاثرات پہلے بھی ظاہر کیے گئے تھے، اور آج بھی ظاہر کیے جا رہے ہیں۔مزید حوالے کے لیے ملاحظہ ہو مجلہ تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، جولائی — ستمبر 1985، صفحہ 24۔

2۔شیخ عبدالحق پراچہ (1920-1979) نے اپنے ایک مطبوعہ مضمون میں بتایا ہے کہ ”جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس امروہہ 1930ء سے کچھ روز قبل انگریز وائسرائے کی کونسل کے ذمہ دار ممبر سر میاں فضل حسین مرحوم (1881-1942) نے مولانا احمد سعید دہلوی (م 9591) کو بلا کر پیشکش کی کہ آپ اجلاس امروہہ میں کانگرس کے ساتھ علماء کے اشتراک عمل کی تجویز پاس نہ ہونے دیں۔ میں حکومت برطانیہ سے مقبرہ صفدر جنگ اور اس سے ملحقہ جائیداد بمعہ آراضی جمعیۃ علماء ہند کے علمی (اور تبلیغی) کاموں کے لیے دلوا دوں گا۔مولانا احمد سعید صاحب (سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند) نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں فرمایا: میاں

صاحب، تمام علماء کرام کیا مجھے بیوقوف نہیں بنائیں گے کہ ہم تو پورے ملک کو حاصل کرنے کی تجویز پاس کر رہے ہیں اور تم صرف ایک مقبرہ، وہ بھی مسلمانوں کی وقف ملکیت، پر فیصلہ کر رہے ہو۔ مولانا کے جواب سے میاں صاحب موصوف کو بہت مایوسی ہوئی۔ یہ واقعہ مولانا احمد سعید دہلوی نے راقم سے خود بیان کیا تھا۔" (الجمعیۃ ویکلی، 2 جنوری 1970ء صفحہ 8)

شیخ عبدالحق پراچہ دہلوی (سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء دہلی) دوسری جگہ لکھتے ہیں، "یہ امر قابل ذکر ہے کہ حکومت برطانیہ نے اپنے ہتھکنڈوں سے جمعیۃ علماء کو ختم کرنے کی پوری جد و جہد جاری رکھی۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہے، میاں سر فضل حسین مرحوم کے ذریعہ مقبرہ صفدر جنگ اور اس سے متعلقہ جائیداد اور آراضی کی پیشکش کرائی تھی جس کو مولانا احمد سعید صاحب نے ٹھکرا دیا تھا۔" (الجمعیۃ ویکلی، 30 جنوری 1970، صفحہ 18)

اس پیشکش پر اب 60 سال گزر چکے ہیں۔ اگر 60 سالہ تاریخ کی روشنی میں غور کیجیے تو نہایت عبرتناک سبق سامنے آتا ہے۔ ہندوستانی علماء کی سیاسی قربانیوں سے یہاں کے مسلمانوں کو کوئی بھی قابل لحاظ چیز حاصل نہ ہو سکی۔ جو لوگ پورے ملک پر قبضے کا خواب دیکھ رہے تھے وہ ملک کے ایک جزئی حصے پر بھی قبضہ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ حتیٰ کہ آج "مقبرہ" جیسے مقامات بھی ہمارے علماء کی دسترس سے باہر ہیں۔

اب تصور کیجیے کہ مسلم رہنما اگر ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب (پریچنگ آف اسلام) کی اہمیت کو صحیح طور پر محسوس کرتے۔ اور پھر دعوتی جذبے کے تحت اگر 1930ء میں انگریز کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے صفدر جنگ کی جائیداد کو لے لیا گیا ہوتا جس کا مجموعی رقبہ کئی کیلومیٹر کے دائرے میں پھیلا ہوا ہے تو کیا ہوتا۔ یہاں ہمارے علماء ایک عظیم الشان تبلیغی ادارہ قائم کر سکتے تھے جس کے سلسلے میں انہیں انگریزوں کی مکمل مدد حاصل ہوتی۔ یہاں تبلیغ و دعوت کی ضرورت کے تمام ادارے وسیع ترین پیمانے پر قائم کیے جا سکتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو

جہاں آج صفدر جنگ ائیر پورٹ قائم ہے وہاں ایک عظیم الشان قسم کی انٹرنیشنل تبلیغی یونیورسٹی موجود ہوتی۔ ہمارے علماء یہاں سے اولاً ملکی سطح پر اور اس کے بعد عالمی سطح پر تبلیغ و دعوت کی مہم جاری کر سکتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو 60 سال کے بعد آج ہندستان کی تاریخ مختلف ہوتی، اور اس کے بعد شاید ساری دنیا کی تاریخ بھی۔

ایک شخص دو مثال

1857ء میں انگریزوں کے خلاف جو بغاوت ہوئی، اس کا ایک معرکہ وہ ہے جو شاملی کے میدان میں لڑا گیا۔ یہاں ایک طرف انگریزی فوج تھی اور دوسری طرف علماء کی جماعت۔ علماء کی اس جماعت کے سربراہ مولانا محمد قاسم نانوتوی (1823-1879) تھے۔ دونوں فریقوں کے درمیان یہ جنگ 1857 میں ہوئی۔ اس جنگ میں انگریزوں کو مکمل کامیابی اور مولانا قاسم نانوتوی کی جماعت کو مکمل ناکامی ہوئی۔ اس مقابلے میں علماء کی ایک تعداد انگریزی فوج کی گولیوں کا نشانہ بنی اور ایک تعداد بھاگ کر منتشر ہو گئی۔

اب تاریخ کا دوسرا منظر دیکھیے۔ مذکورہ جنگ کے 20 سال بعد 1876 میں شاہجہاں پور میں ایک مناظرہ ہوا۔ اس کا نام "میلہ خدا شناسی" تھا۔ یہ دراصل ایک مذہبی مناظرہ تھا جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی تینوں مذہبوں کے علماء شریک ہوئے۔ کہا جاتا کہ یہ مناظرہ انگریزوں کی سازش کے تحت کرایا گیا تھا۔

ہندو اور عیسائی مذہب کے نمائندوں نے اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے کے لیے پر جوش تقریریں کیں۔ اسلام کے بارے میں بھی کئی علماء نے تقریریں کیں۔ مثلاً مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا رحیم اللہ بجنوری اور مولانا فخر الحسن وغیرہ۔ آخر میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کھڑے ہوئے۔ ان کی تقریر کا موضوع اثبات توحید اور ابطال شرک تھا۔ مولانا نانوتوی کی تقریر اتنی شاندار تھی کہ موافق و مخالف دونوں ہی اس سے مسحور ہو گئے۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا جیسے کسی نے سننے والوں پر جادو کر دیا ہو۔ مذہب اسلام کی صداقت اس طرح آشکارا ہوئی کہ لوگوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ مجمع دم بخود تھا اور سننے والے ایسا محسوس کر رہے تھے کہ بیان کرنے والا کوئی عام انسان نہیں بلکہ آسمان سے اترنے والا فرشتہ ہے جو ایسی مؤثر تقریر کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ خود انگریز پادری اسکاٹ نے اس کو سن کر کہا کہ اگر تقریروں پر ایمان لایا جاتا تو یہ تقریر ایسی تھی کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ (سوانح قاسمی، جلد 2، صفحہ 441)

ان دونوں واقعات کا فرق نہایت سبق آموز ہے۔ وہی مولانا قاسم نانوتوی ہیں۔ وہ 1857 میں انگریزوں مقابلہ کرتے ہیں۔ اس میں انھیں مکمل شکست ہوتی ہے۔ پھر 1876 میں وہی مولانا قاسم نانوتوی عیسائی مشنریوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو انہیں اس میں مکمل فتح حاصل ہوتی ہے۔ ایک ہی شخص ہے، اور اس کا انجام دو میدانوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، ایک جگہ کامل شکست، اور دوسری جگہ کامل فتح۔

اس فرق کا راز یہ ہے کہ 1857 میں مولانا نانوتوی کا مقابلہ ''حربی انگریزوں'' سے ہوا تھا۔ اور 1876 میں ان کا مقابلہ ''مبلغ انگریزوں'' سے ہوا۔ حربی انگریزوں سے لڑنے کے لیے ہتھیار درکار تھا جو ان کے پاس ضروری مقدار میں موجود نہ تھے۔ اس کے برعکس، مبلغ انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے اسلام کا نظریہ کافی تھا جو ان کے پاس مکمل طور پر موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نانوتوی 1857 میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ اور 1876 میں مکمل طور پر کامیاب۔

یہ واقعہ سو سال سے بھی زیادہ پہلے پیش آچکا ہے۔ مگر مسلم رہنماؤں نے اس سے کوئی سبق نہیں لیا۔ وہ بدستور ساری دنیا میں ''حربی انگریزوں'' سے ناکام لڑائی لڑنے میں مشغول ہیں۔ وہ ''مبلغ انگریزوں'' سے مقابلے کے لیے نہیں اُٹھتے۔ جس میدان میں ان کے لیے

شکست مقدر ہے، وہاں وہ مسلسل لڑ رہے ہیں۔ اور جس میدان میں ان کے لیے ابدی طور پر فتح لکھی ہوئی ہے، اس کو انہوں نے چھوڑ رکھا ہے۔ نادانی کی یہ قسم اتنی عجیب ہے کہ اس کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی، خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کی توجیہ کے لیے یکجا کر دیے گئے ہوں۔

اصلاح کی طرف

صلیبی لڑائیاں (crusades) ان جنگی مہموں کو کہا جاتا ہے جو مغربی یورپ کی مسیحی حکومتوں نے مسلم حکومتوں کے خلاف جاری کیں۔ اس سلسلے کی پہلی مہم 1095ء میں شروع ہوئی۔ اور 1271ق ء تک وقفہ وقفہ سے جاری رہی۔ ان جنگی مہموں کا مقصد مقدس یروشلم کو بددینوں (مسلمانوں) کے قبضے سے نکالنا تھا۔ مگر مسیحی طاقتوں کو اپنی اس مہم میں مکمل ناکامی ہوئی۔

ایچ جی ویلز نے اپنی کتاب (The Outline of History) میں لکھا ہے کہ پہلی صلیبی مہم کے وقت یورپ کے مسیحیوں میں بڑا جوش وخروش تھا۔ مگر تیرہویں صدی کے آخر میں جب انہیں مکمل شکست ہوئی تو اس کے بعد کسی نئی صلیبی جنگ چھیڑنے کے لیے مسیحی قوموں کے حوصلے بالکل ختم ہوگئے۔ اس کے بعد یہ حال ہوا کہ اگر کوئی شخص نئی صلیبی مہم کا نام لیتا تو ایک عام شہری تعجب سے کہہ اٹھتا کیا، ایک اور صلیبی جنگ:

"What! another crusade!" (p. 673)

تیرہویں صدی کے آخر میں یورپ کی مسیحی قوموں پر مسلمانوں کا ایسا رعب چھا گیا تھا کہ وہ مزید کوئی صلیبی مہم شروع کرنے کو تعجب خیز حد تک ناقابل عمل سمجھتے تھے۔ مگر ساڑھے چھ سو سال بعد پہلی عالمی جنگ میں صورت حال بالکل بدل چکی تھی۔ برٹش کمانڈر ایلنبی (E.H.H. Allenby) فتح کرتا ہوا 9 دسمبر 1917ء کو یروشلم میں داخل ہوگیا۔ اس نے بیت المقدس کے اندر کھڑے ہوکر کہا کہ آج صلیبی جنگیں ختم ہوگئیں:

دوسری طرف فرنچ جنرل ہنری گورو (Henri Gouraud) نے شام کو فتح کرلیا۔ 1920ء میں وہ فاتحانہ طور پر دمشق میں داخل ہوگیا۔ اس نے صلاح الدین ایوبی کی قبر پر پاؤں رکھ کر کہا کہ صلاح الدین، دیکھو آخر کار ہم واپس آگئے:

یہ صورت حال تادمِ تحریر بدستور باقی ہے۔ اس دوران بے شمار ہنگامہ خیز کوششیں ہوئی ہیں۔ ان کوششوں میں بے شمار جانی و مالی نقصان ہوا ہے، مگر اصل صورت حال میں اب تک کوئی تبدیلی نہ ہوسکی۔ صلیبی مقابلہ جو تیرہویں صدی میں مسلمانوں کے حق میں ختم ہوا تھا، وہ بیسویں صدی میں بظاہر مسیحیوں کے حق میں ختم ہو چکا ہے۔

پچھلے 70 سال کے دوران بار بار یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں مسلمان اس قدر غالب تھے، اور بیسویں صدی میں وہ اتنے زیادہ مغلوب ہو گئے۔ اس کے جواب میں تقریروں اور مضامین اور کتابوں کا ایک ناقابل شمار انبار جمع ہو چکا ہے۔ مگر ان سب کا خلاصہ صرف ایک ہے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا صرف یہ انکشاف کر رہا ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے، اور انہیں سازشوں نے مسلمانوں کو ناکام بنا رکھا ہے۔

یہ توجیہ لغویت کی حد تک غلط ہے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ”تیرھویں صدی“ میں وہ تمام سازشیں مزید شدت کے ساتھ جاری تھیں جن کا حوالہ آج مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے دے رہے ہیں۔ اس کے باوجود ماضی کے مسلمانوں کو بے مثال کامیابی حاصل ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا مقابلے کی دنیا ہے، یہاں ہمیشہ ایک کو دوسرے کی طرف سے چیلنج پیش آتا ہے۔ یہاں ہمیشہ ایک قوم کے خلاف دوسری قوم سازشیں کرتی ہے۔

یہ صورت حال ابتداءِ انسانیت کے ہابیل و قابیل سے جاری ہے، اور آخر انسانیت کے مسیح اور دجال تک جاری رہے گی، وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اس دنیا میں مخالفتوں اور سازشوں کے باوجود کامیابی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ جو لوگ اس ”باوجود“ کے چیلنج کا سامنا کر

سکیں، وہی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں میں اس "باوجود" کے چیلنج کا سامنا کرنے کی طاقت نہ ہو، ان کے لیے اس دنیا میں جو چیز مقدر ہے وہ صرف یہ کہ وہ لفظی شکایت اور احتجاج کا جھوٹا طوفان اٹھائیں اور بالآخر صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہ جائیں۔

"کیا وجہ ہے کہ مسلمان تیرھویں صدی میں غالب تھے اور بیسویں صدی میں وہ مغلوب ہیں" یہ جملہ جو پچھلے 70 سال سے بار بار دہرایا جا رہا ہے، وہ خود بنیادی طور پر غلط ہے۔ کیوں کہ وہ ایک غلط مفروضے پر قائم ہے۔ اس جملے میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ تیرھویں صدی میں جو مسلمان تھے، وہی مسلمان آج بھی ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ موجودہ مسلمان پچھلے مسلمانوں کی بعد کی اولادیں ہیں۔ وہ اسلاف تھے اور یہ اخلاف ہیں۔ موجودہ مسلمان زیادہ صحیح طور پر قرآن کی اِن آیتوں کا مصداق ہیں:

- "پھر ان کے بعد ناخلف لوگ آئے جو کتابِ الٰہی کے وارث بنے۔ وہ اسی دنیا کی متاع لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یقیناً بخش دیے جائیں گے۔ اور اگر ایسی ہی متاع ان کے سامنے پھر آئے تو وہ اس کو لے لیں گے۔ کیا ان سے کتاب میں اس کا عہد نہیں لیا گیا ہے کہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ کہیں۔ اور انھوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لیے، کیا تم سمجھتے نہیں۔ اور جو لوگ خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، بے شک ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔" (7:169-170)
- "پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشوں کا اتباع کیا۔ پس عنقریب وہ اپنی خرابی کو دیکھیں گے۔ البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کیا تو یہی لوگ جنّت میں داخل ہوں گے اور ان کی

ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔"(19:59-60)

- " کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں اور اس حق کے آگے جو نازل ہوا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اس کی موت کے بعد۔ ہم نے تمہارے لیے نشانیاں بیان کردی ہیں تاکہ تم سمجھو۔"(57:16-17)

ان آیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر جب لمبی مدت گزر جاتی ہے، تو ان کے افراد میں قساوت (بے حسی) آجاتی ہے۔ وہ دین کی حقیقت کھو دیتے ہیں۔ ان کے اسلاف اگر حقائق پر جینے والے تھے، تو ان کی بعد کی نسلیں خوش فہمیوں کی بنیاد پر زندہ ہوتی ہیں۔ یہ بعد کے لوگ شکلِ دین کے اعتبار سے زندہ نظر آتے ہیں، مگر وہ روحِ دین کے اعتبار سے مردہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد "مصلحینِ امت" کو کیا کرنا چاہیے، اس کو ایک تمثیل کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ یہ زمین کی تمثیل ہے۔ زمین اگر مردہ اور بنجر ہو گئی ہو تو کسان کیا کرتا ہے۔ کسان یہ نہیں کرتا کہ جس حالت میں بھی وہ زمین ہے، اسی حالت میں لاکر وہاں دانہ بکھیر دے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس طرح دانہ بکھیر دینے سے یہاں فصل نہیں اگے گی۔ کسان ایسی زمین کے لیے پانی کا انتظام کرتا ہے۔ وہ اس کو جوتتا ہے۔ اس کے جھاڑ جھنکاڑ صاف کرتا ہے۔ اس میں کھاد ڈالتا ہے۔ اس طرح جب زمین تیار ہو جاتی ہے، تو وہ اس میں بیج ڈالتا ہے۔ اس کے بعد نتیجہ سامنے آتا ہے اور جہاں پہلے سوکھی زمین تھی، وہاں لہلہاتی ہوئی فصل نظر آنے لگتی ہے۔

یہی معاملہ اس قوم کا ہے جو "طولِ امد" کے نتیجے میں مردہ ہوگئی ہو۔ ایسی قوم میں اصلاح کا کام صرف بیج ڈال کر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ زمین تیار کرنے سے وہاں اصلاحی کام کا آغاز کرنا ہوگا۔ کسی مردہ قوم کا حال اگر بظاہر مایوس کن ہو تو اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ خدا کی دنیا میں زمین جس طرح مردہ سے زندہ ہوجاتی ہے، اسی طرح یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ بے جان قوم دوبارہ ایک جاندار قوم بن جائے۔ بشرطیکہ اس کے اوپر وہ کام کیا جائے جو ایک بے جان قوم کو جاندار بنانے کے لیے کرنا ضروری ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا اصل معاملہ یہ تھا کہ وہ طولِ امد کے نتیجے میں ایک بے جان قوم بن چکے تھے۔ ان کی حیثیت اب ایک مردہ زمین کی ہوچکی تھی۔ اس صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کے درمیان کام کا آغاز "اصلاح" سے کیا جائے۔ مگر موجودہ زمانے میں اٹھنے والے تمام رہنماؤں نے اس کے بجائے یہ کیا کہ کام کا آغاز "اقدام" سے کیا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے بنجر زمین میں زراعت کا آغاز پودا لگانے سے کیا جائے۔ چنانچہ مسلم رہنماؤں کی تمام ہنگامہ خیز تحریکیں مکمل طور پر ناکامی و بربادی پر ختم ہوکر رہ گئیں۔

موجودہ زمانے میں اصلاحِ امت کے لیے جو کام مطلوب ہے وہ بیک وقت گہری دانائی بھی چاہتا ہے اور اسی کے ساتھ مستقل عمل بھی۔ اس کام کو مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

1۔ پہلا کام تجدید ایمان ہے۔ تجدید ایمان سے مراد ادائیگی کلمہ کی تصحیح نہیں ہے، بلکہ کلمہ کی بنیاد پر ایک مکمل شعوری انقلاب ہے۔ موجودہ مسلمان جو صرف "کلمہ گو" مسلمان ہیں، انہیں اس سے اٹھا کر "کلمہ فہم" مسلمان بنانا ہے۔ ان کا ایمان جو الفاظ کی سطح پر ٹھہر گیا ہے، اس کو معانی کی سطح پر پہنچانا ہے۔

2۔ یہ کام لازماً تنقید کے اسلوب میں کام کرنا ہوگا۔ مثلاً جو لوگ "اکابر" کی سطح پر اٹکے

ہوئے ہیں، انہیں خدا کی سطح پر پہنچانا ہوگا۔ جولوگ اسلام اور غیر اسلام دونوں کو اپنے ذہن میں جمع کیے ہوئے ہیں، انہیں اسلام کے لیے یکسو کرنا ہوگا۔ جولوگ صحیح اور غلط کی تمیز سے محروم ہیں، ان کے اندر صحیح اور غلط کی تمیز پیدا کرنا ہوگی۔ جن لوگوں کا اسلام برف کی طرح جامد ہو چکا ہے، اس کو توڑ کر اس کو رواں سیلاب بنانا ہوگا۔ یہ تمام کام تنقید کے طالب ہیں۔ ان میں سے کوئی کام بھی تنقید کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک تنقید نہ کی جائے، ذہنوں میں ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ "ایک" کو چھوڑنے اور "دوسرے" کو اختیار کرنے کا مرحلہ نہیں آتا۔ اسلام وہی ہے جو آدمی کو ذاتی دریافت کے طور پر ملے، اور ذاتی دریافت والا اسلام تنقیدی اندازِ دعوت کے بغیر کسی کو ملنا ممکن نہیں۔

3۔ اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ مسلمانوں کو ان نام نہاد سرگرمیوں سے ہٹایا جائے جو الٹی ذہنی تربیت کرنے والی ہیں۔ جو آدمی کو جذباتی بناتی ہیں۔ جو آدمی کو حقیقت پسندی سے دور کر دیتی ہیں۔ جو قدیم ذہن کو بدستور پختہ کرتی چلی جاتی ہیں۔ جو آدمی کو خوش عقیدگی کے خول سے باہر نکلنے نہیں دیتیں۔ یہ کام بھی بہر حال کرنا ہوگا خواہ ابتداءً اس تحریک کے گرد عوام کی بھیڑ جمع نہ ہو سکے۔

4۔ مسلمانوں کے ایمان کو اگر شعوری انقلاب کے مرحلے تک پہنچانا ہے تو ان کو ان سرگرمیوں سے روکنا ہوگا جن کو وہ محض بے شعوری کے تحت جاری کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً دوسری قوموں سے قومی، سیاسی اور مادی لڑائی۔ جلسہ جلوس کی دھوم، اسلام کے نام پر جشن کے ہنگامے برپا کرنا۔ اپنے مسائل کو اپنی کوتاہی کے خانے میں ڈالنے کے بجائے دوسروں کی سازش اور ظلم کے خانے میں ڈالنا۔ مسلمانوں کو جب تک ان غیر حقیقی سرگرمیوں سے روکا نہ جائے، ان کے اندر کوئی حقیقی مزاج پیدا ہونا ممکن نہیں۔

5۔ وہ چیز جس کو "عملی پروگرام" یا عملی اقدام کہا جاتا ہے، وہ اپنے وقت پر ضروری اور مفید ہے، مگر وقت سے پہلے، جب کہ ابھی تحریک ابتدائی فکری مرحلے میں ہو، ایسا کوئی اقدام صرف نقصان اور ہلاکت پر ختم ہوتا ہے۔

مثلاً آج کل ہر سطحی لیڈر ایک جذباتی اشو پر مسلمانوں کو جمع کرتا ہے اور ان کا جلوس نکالتا ہے۔ اگر اس کو اس فعل عبث سے منع کیا جائے تو وہ کہے گا کہ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اور جمہوریت کے نظام میں کسی مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ مگر یہ جواب احمقانہ حد تک لغو ہے۔ اس کی غلطی اس وقت واضح ہوجاتی ہے جب کہ مسلمانوں کا جلوس کچھ دور چلنے کے بعد عوام سے یا پولیس سے لڑ جاتا ہے اور تشدد پر اتر آتا ہے۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کا جلوس نکالنا غلط تھا۔ کیوں کہ جمہوریت کے نظام میں پُر امن مظاہرہ عوام کا حق ہے، مگر متشدد (پُر تشدد) مظاہرہ ایک قانونی جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں سطحی لیڈر دوبارہ کہہ دے گا کہ مسلمانوں کا تشدد بطور ردّ عمل تھا۔ مگر یہ جواب دوبارہ صرف لیڈر کی جہالت کا ثبوت ہے۔ اس دنیا میں ہمیشہ اشتعال کے اسباب پیش آتے ہیں۔ اس قسم کے اسباب سے کوئی ملک یا کوئی سماج کبھی خالی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس دنیا میں "مظاہرہ" صرف ان لوگوں کے کرنے کا کام ہے جو اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ جو تشدد کے اسباب پیش آنے کے باوجود پُر امن بنے رہیں۔ چونکہ موجودہ مسلمان ابھی اس شعوری سطح پر نہیں ہیں، اس لیے ان کو مظاہرے کی سیاست میں استعمال کرنے کا وقت بھی ابھی نہیں آیا۔

اصل کمی

موجودہ زمانے کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کے پاس آئیڈیالوجی ہے، مگر اسلام کے پاس آج مردان کار نہیں۔ اس صدی کے آخر تک ساری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک

ارب ہو جائے گی۔ مگر یہ تقلیدی مسلمانوں کی بھیڑ ہے، وہ شعوری مسلمانوں کی جماعت نہیں۔ موجودہ زمانے میں کوئی بھی قابل ذکر تحریک نہیں اٹھی جو ان مسلمانوں کو تقلید قومی کی سطح سے اٹھا کر شعور ربانی کی سطح پر پہنچانے کی کوشش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی بھیڑ کے باوجود وہ مسلم ٹیم موجود نہیں جو اسلام کے احیاء کی راہ میں کوئی حقیقی اور مؤثر جدو جہد کر سکے۔

یہی آج کا پہلا اور اصلی کام ہے۔ آج سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو شعوری معنوں میں مسلمان بنایا جائے۔ اسلام ان کے لیے فکری انقلاب کے ہم معنی بن جائے۔ جس دن ایسا ہو گا اسی دن وہ نئی تاریخ بھی بننا شروع ہو جائے گی جس کا صدیوں سے زمین و آسمان کو انتظار ہے۔

اسلام اکیسویں صدی میں

انسان آج ایک نئے نظریے کی تلاش میں ہے۔ جو لوگ جدید انسان کو یہ نظریہ فراہم کر دیں وہی اکیسویں صدی کی دنیا کے قائد ہوں گے۔ یہ نیا نظریہ بریڈلے (F.H. Bradley) کے الفاظ میں ایک نیا مذہب (new religion) ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھیے تو بریڈلے کا نیا مذہب حقیقتاً وہی چیز ہے جس کو غیر محرف مذہب کہا جاتا ہے۔ بریڈلے اگر محرف اور غیر محرف کے فرق کو جانتا تو یقیناً وہ اپنے مطلوب مذہب کو بتانے کے لیے غیر محرف مذہب کا لفظ استعمال کرتا۔ مگر اس فرق سے نا آشنا ہونے کی بنا پر اس نے "نیا مذہب" کا لفظ استعمال کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج جدید انسان جس چیز کی تلاش میں ہے وہ صرف اسلام ہے۔ جو فطرت کا دین ہے اور تحریف سے پاک ہونے کی وجہ سے کامل سچائی کا حامل ہے۔ اگرچہ اس سے نا آشنا ہونے کی بنا پر انسان اپنے مدعا کو بتانے کے لیے دوسرے دوسرے الفاظ بولتا ہے۔ مثلاً نیا نظریہ، نیا مذہب، نیا نظام، نیا انقلاب وغیرہ۔

بیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر انسان ایک فکری خلا سے دوچار ہوا ہے۔ اس نے اپنی سابقہ فکری بنیاد مکمل طور پر کھو دی ہے۔ اب اس کو نئی فکری بنیاد کی تلاش ہے جس کے اوپر وہ اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔ اس معاملے کی وضاحت کے لیے یہاں میں جاپان کا تجربہ نقل کروں گا۔

جاپان کی مثال

جاپان کا موجودہ شاہی خاندان پچھلے 15 سو سال سے جاپان پر حکومت کرتا رہا ہے۔ جاپانی لوگ اپنے بادشاہ کو خدا (Kami) کہتے تھے۔ وہ اس کو خدائی اوصاف کا مالک سمجھتے

تھے۔مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد وہ اپنے بادشاہ کو صرف ایک انسان (Hito) سمجھنے لگے ہیں۔ یہ تبدیلی جاپانیوں کے لیے ایک زبردست فکری بھونچال کے ہم معنی ہے۔

پچھلے ڈیڑھ ہزار برس سے جاپانی اپنے بادشاہ کو خدا سمجھتے آرہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے بادشاہ کے اندر خدائی صفات ہیں۔ اور وہ ہر طاقت کے مقابلے میں ان کی حفاظت کر سکتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاسا کی پر ایٹم بم گرائے تو اچانک جاپان کی فوجی طاقت ختم ہوگئی۔ 15 سو سال میں پہلی بار ایسا ہوا کہ جاپان کسی خارجی طاقت کے مقابلے میں مکمل شکست کھا گیا۔ جاپانی شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے 15 اگست 1945 کو ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم جنگ ہار چکے ہیں اور ہم امریکہ کے مقابلے میں ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ جاپانیوں کے لیے اپنے خدائی بادشاہ کا یہ کلام انتہائی غیر متوقع تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا بادشاہ خدا ہے، اس لیے کوئی قوم اس کو شکست نہیں دے سکتی۔مگر جب بادشاہ نے خود اپنی شکست کا اقرار کرلیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا بادشاہ صرف ایک انسان ہے، وہ کوئی برتر خدا نہیں۔

یہ واقعہ جاپانیوں کے لیے ایٹم بم سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ ایٹم بم نے وقتی طور پر ان کے دو شہروں کو تباہ کیا تھا۔مگر عقیدے کی اس محرومی نے جاپانیوں کی اندرونی شخصیت کو مستقل طور پر برباد کر دیا ہے۔ جاپان کی نئی نسل سخت مایوسی (frustration) کا شکار ہے۔ انہوں نے روحانی اعتبار سے اپنا سرچشمۂ اعتماد (source of confidence) کھو دیا ہے۔ جاپانی قوم آج ایک نئے خدا کی تلاش میں ہے۔ اور یہی اس وقت جاپان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

یہ صورتِ حال جو جاپان کے ساتھ پیش آئی ، یہی ایک یا دوسری صورت میں ، موجودہ زمانے کی تمام قوموں کا حال ہے۔ ہر ایک نے اس ”خدا“ کو کھو دیا ہے جس پر وہ روایتی

طور پر قائم تھا۔ اسی کے ساتھ ہر ایک، شعوری یا غیر شعوری طور پر، ایک نئے خدا کی تلاش میں ہے جس کو وہ اپنے کھوئے ہوئے خدا کا بدل بنا سکے۔

یہ معاملہ محض اتفاقی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اور مذہب کوئی اوپری یا خارجی معاملہ نہیں، یہ انسان کی سب سے بڑی اندرونی طلب ہے۔ یہ اس کی فطرت میں اس طرح پیوست ہے کہ اس کو کسی طرح انسان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ نفسیات اور اینتھراپالوجی کی ریسرچ نے اس کو آخری طور پر ثابت کر دیا ہے کہ انسان خدا اور مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (*Encyclopedia Britannica*, 15/628)

اس بات کو ایڈمنڈ برک (Edmund Burke, 1729-1797) نے مختصر طور پر ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ انسان اپنی تشکیل کے اعتبار سے ایک مذہبی حیوان ہے:

"Man is by his constitution a religious animal."
(*Reflections on the Revolution in France,* London, p.135)

یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان خود اپنی اندرونی فطرت کے زور پر ایک سچے اور حقیقی خدا کی تلاش میں ہے جو اس کی ہستی کے پورے تقاضے کا جواب بن سکے۔

خدائے واحد کی تلاش

اہل اسلام کے سوا دنیا میں جو قومیں آباد ہیں ان کی بیشتر تعداد کسی نہ کسی اعتبار سے شرک میں مبتلا رہی ہے۔ مجوس دو خدا کو مانتے ہیں۔ مسیحیت میں تین خدا کا عقیدہ ہے۔ ہندو دھرم میں خداؤں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کا شمار نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہندو دیوتاؤں کی تعداد 33 کروڑ (33,000,000) ہے۔ (*Encyclopedia Britannica,* 14/787)

یہ مشرکانہ عقیدہ جو بیشتر لوگوں کو اپنے ماضی سے ملا تھا، اس نے موجودہ زمانے میں انہیں سخت قسم کی تضاد فکری میں مبتلا کر دیا ہے۔ کیوں کہ جدید علم (science) نے انہیں

جس دنیا کا تعارف کرایا ہے وہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا کہ اس کائنات کے کئی خدا ہوں۔ کائنات میں کامل ہم آہنگی (harmony) پائی جاتی ہے۔ وہ ایک عظیم مشین کی طرح مکمل اتحاد کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ ایسی ایک دنیا کے ساتھ ایک خدا کا عقیدہ مطابقت رکھتا ہے، نہ کہ کئی خدا کا۔ اس صورت حال نے لوگوں کے لیے اپنے روایتی مذہب کی صداقت کو سخت مشتبہ بنا دیا ہے۔

اس سلسلے میں آخری ضرب (below) وہ تازہ سائنسی دریافت ہے جس کو برتر ڈور (superstring theory) کہا جاتا ہے۔ سائنس داں روایتی طور پر یہ سمجھتے تھے کہ کائنات میں چار فطری طاقتیں (forces) کام کر رہی ہیں:

"Gravity, Electromagnetic force, Week nuclear force, Strong nuclear force." (*Beyond Einstein,* A Bantam Book, March, 1987)

تاہم کائنات کے وحدانی نظام کے ساتھ چار طاقتوں کا تصور مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ آئن اسٹین سے لے کر اب تک مسلسل یہ کوشش جاری تھی کہ اس تعداد کو ختم کیا جائے۔ اب تازہ خبر یہ ہے کہ امریکہ کے سائنسدانوں کی ایک ٹیم برسوں کی محنت کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ صرف ایک طاقت ہے جو پوری کائنات کو کنٹرول کرتی ہے۔ اس طاقت کا نام انہوں نے برتر ڈور (superstring) رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو امریکی جریدہ اسپان (جون 1989) میں شایع شدہ مقالہ (The Theory of Everything)، نیز حسب ذیل امریکی کتابیں:

1. Beyond Einstein, The Cosmic Quest for the Theory of the Universe, Dr. Michio Kaku and Jennifer Trainer, 1987.

2. Nuclear Power Both Sides, by Jennifer Trainer, and Michio kaku, New York, 1982.

اس علمی دریافت نے انسان کو آج عین عقیدۂ توحید کے کنارے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اب وہ آخری وقت آ گیا ہے جب کہ انسان کے سامنے ایک خدا کا نظریہ پیش کیا جائے اور وہ اس کو عین اپنے دل کی آواز سمجھ کر اُسے قبول کر لے۔

آزادانہ تحقیق کا نتیجہ

قدیم زمانے میں مذہب کو صرف تقدس کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں پر یہ تصور چھایا ہوا تھا کہ مذہبی عقائد اس سے بلند ہیں کہ ان کو کسی جانچ اور بحث کا موضوع بنایا جائے۔ مگر موجودہ زمانے میں سائنس کے زیر اثر جو فکری انقلاب آیا ہے، اس نے تحقیق (inquiry) کو سب سے زیادہ اونچا درجہ دے دیا ہے۔ آج کا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہر چیز کی آزادانہ تحقیق (free inquiry) ہونی چاہیے۔ کسی بات کو صرف اس وقت ماننا چاہیے جب کہ آزادانہ تحقیق کی کسوٹی پر وہ ثابت شدہ بن گئی ہو۔

جدید انسان نے اس فکر کا استعمال جس طرح جامد مادہ کی دنیا میں کیا، اسی طرح اس نے اس کا استعمال مذہب پر بھی کیا۔ مذہبی کتابوں اور ان کی تعلیمات کی جانچ کی جانے لگی۔ اس جانچ نے پہلی بار خالص علمی سطح پر یہ ثابت کیا کہ اسلام کے سوا دوسرے تمام مذاہب غیر معتبر ہیں۔ علمی اور تاریخی اعتبار سے وہ قابلِ اعتماد نہیں۔ اس معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔

مسیحیت کی بنیاد تثلیث (trinity) کے عقیدہ پر قائم ہے۔ آپ کسی مسیحی عالم سے عقیدۂ خدا پر گفتگو کریں تو وہ کہے گا کہ خدا کی فطرت تثلیث ہے:

"The nature of God is trinity."

تثلیث کا مطلب، ارباب چرچ کی تشریح کے مطابق، تین میں ایک، ایک میں تین (3 in one, one in 3) ہے۔ اب آج کا انسان جو ہر معاملے کو عقل سے سمجھنا چاہتا ہے

وہ عیسائی عالم سے سوال کرتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک اور ایک اور ایک مل کر ایک ہوں:

How can 1+1+1=1?

مسیحی عالم پہلے ناقابل فہم اصطلاحوں میں اس کو سمجھانا چاہے گا اور جب وہ دیکھے گا کہ جدید ذہن اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہورہا ہے تو آخر کار وہ یہ کہہ دے گا کہ وہ چیزیں ہیں جن کو ہم سمجھ نہیں سکتے:

"These are things that we cannot understand."

مگر اس قسم کا کوئی جواب جدید انسان کے لیے ناقابل فہم اور ناقابلِ قبول ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ جب وہ کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو کائنات پوری طرح معلوم ریاضیاتی ڈھانچہ (mathematical frame) میں ڈھل جاتی ہے۔ چنانچہ ایک سائنس داں کو اسے دیکھ کر یہ کہنا پڑا کہ کائنات کا خالق ایک اعلیٰ درجہ کا ریاضیاتی ذہن (mathematical mind) ہے۔ مگر خود خالق کے عقیدے کو مسیحیت جس انداز میں پیش کرتی ہے وہ سراسر غیر ریاضیاتی اور غیر عقلی ہے۔

اس صورت حال نے جدید انسان کو ایک نازک مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ اپنی فطرت کے زور پر وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے خدا کو پائے۔ وہ خالق کائنات پر ایمان لا کر اس کا پرستار بن جائے۔ مگر مروّجہ مذاہب اس کے سامنے خدا کا جو تصور پیش کر رہے ہیں وہ اس کی فطرت کے تقاضوں کے بھی خلاف ہے اور اس کے علمی اور عقلی ڈھانچے کے بھی خلاف۔

اس طرح جدید فکری انقلاب نے آج کے انسان کو عین اسلام کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے کہ انسان کے سامنے توحید کا سچا تصور پیش کیا جائے جو فطرت اور علم دونوں کے عین مطابق ہے۔ یہاں دونوں باتوں میں وہ ٹکراؤ نہیں جو موجودہ محرف مذاہب میں پایا جا رہا ہے۔

مذاہب کا تضاد

آج کل روزانہ اخبارات و رسائل میں ایسی خبریں آ رہی ہیں جن میں بتایا جاتا ہے کہ کس طرح فلاں شخص اپنے آبائی مذہب سے بدظن ہو کر اسلام میں داخل ہو گیا۔

مثال کے طور پر ہفت روزہ الدعوۃ (ریاض) نے اپنے شمارہ 17 اگست 1989ء (صفحہ 14) میں یہ خبر چھاپی ہے کہ زائر کی راجدھانی کن شاسا (Kinshasa) کے ایک قسیس (priest) جو مقدس جان (Holy John 23) کہے جاتے تھے۔ ان کا نام مویاوا مویا تھا، انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ان کا نیا نام عثمان وامویا ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے اسلام کیوں قبول کیا۔ انہوں نے بتایا کہ موجودہ انجیلوں کے داخلی تناقضات نے انہیں مسیحیت سے بدظن کر دیا۔ مثلاً یہ انجیلیں حضرت مسیح کو کبھی اللہ کا بندہ کہتی ہیں اور کبھی اللہ کا بیٹا (إِذَا تَقْرَأُ أَحْيَانًا أَنَّهُ عَبْدُ اللّٰهِ، ثُمَّ تَزْعُمُ أَنَّهُ ابْنُ اللّٰهِ)۔

ایک شخص جب انجیل پڑھتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ متی کی انجیل میں حضرت مسیح کا جو نسب نامہ ہے اس میں حضرت مسیح کو مسیح ابن داؤد (Christ, the son of David) لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد جب پڑھنے والا مرقس کی انجیل تک پہنچتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ وہاں جو اندراج ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ مرقس کی انجیل کی پہلی آیت میں اس کے برعکس، مسیح ابن خدا (Christ, the son of God) کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ گویا ایک ہی شخصیت کو ایک جگہ خدا کا بیٹا بتایا گیا ہے اور دوسری جگہ انسان کا بیٹا۔

اس قسم کے بے شمار تناقضات ہیں جن سے موجودہ انجیلیں بھری ہوئی ہیں۔ یہ واقعہ آدمی کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ موجودہ بائبل اگر خدا کی کتاب ہے تو انسانی تحریفات نے اس کی ابتدائی شکل کو بالکل بدل ڈالا ہے۔ اگر وہ اپنی ابتدائی شکل میں ہوتی تو ناممکن تھا کہ اس کے اندر اس قسم کے کھلے کھلے تضادات پائے جائیں۔

اس صورت حال نے جدید انسان کو تمام مذاہب کی کتابوں سے بدظن کر دیا ہے۔ تاہم وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے باوجود اس کو ایک مذہب کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ مذہب کی طلب انسان کی فطرت میں پیوست ہے، وہ عملی زندگی میں اس کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ وہ محرف مذاہب سے بیزار ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ غیر محرف مذہب کا شدت سے طلب گار بنا ہوا ہے۔ اسی حالت میں اگر اس کے سامنے اسلام کو پیش کیا جائے تو یہ پیاسے کے سامنے پانی پیش کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ وہ اس سے واقف ہوتے ہی فوراً اس کو اپنی چیز سمجھ کر اسے اپنا لے گا۔

اخوت ومساوات کا مذہب

انسان اور انسان کے درمیان فرق یا عدم مساوات قدیم ترین زمانے سے چلا آرہا ہے۔ قدیم زمانے میں توہمات (superstitious) کا غلبہ تھا۔ انسان طرح طرح کے توہماتی عقائد کے تحت انسانوں کے درمیان اِس غیر مساوی تقسیم کو برحق سمجھے ہوئے تھا۔ مثلاً یہ کہ سفید فام لوگ کسی اعلیٰ مادۂ تخلیق سے بنے ہیں اور سیاہ فام لوگ کسی ادنیٰ مادہ تخلیق سے۔ چنانچہ کچھ لوگ نسلی اعتبار سے برتر (superiors) ہیں اور کچھ لوگ ان سے کمتر (inferiors)۔

موجودہ زمانے میں سائنسی افکار نے اس قسم کے عقیدے کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ عدم مساوات کو جائز قرار دینے والے تمام عقائد سراسر فرضی ہیں۔ علمی اعتبار سے ان کی کوئی واقعی بنیاد نہیں۔ موجودہ زمانے میں نسلی امتیاز کے افسانوں (racial myths) کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لیے کثرت سے علمی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک اہم کتاب کا نام یہ ہے:

I. Comas, *The Race Question in Modern Science*, 1956

اب انسان اپنے آپ کو ایک دوراہے پر کھڑا ہوا پاتا ہے۔ ایک طرف اس کا آبائی اور روایتی مذہب ہے۔ جس کی تعلیمات بدستور انسانی نابرابری کی تصدیق کر رہی ہیں۔ دوسری طرف اس کا سائنسی علم ہے جو اس قسم کے کسی عقیدے کو سراسر لغو قرار دیتا ہے۔ جدید انسان یہ محسوس کر رہا ہے کہ اپنے آبائی مذہب کو مانتے ہوئے وہ سائنسی بنیاد پر اپنی زندگی کی تشکیل نہیں کرسکتا۔

یہاں صرف اسلام ہے جو غیر محرّف ہونے کی بنا پر صحیح ترین تعلیمات کا حامل ہے نہ صرف یہ کہ اس معاملے میں اسلام کی تعلیمات عین سائنسی حقائق سے ہم آہنگ ہیں بلکہ اسلام عملی طور پر بھی انسانی مساوات کی واحد شاندار تاریخ رکھتا ہے۔ ایچ جی ویلز نے اعتراف کیا ہے کہ اسلام نے نہ صرف لفظی طور پر انصاف اور مساوات کی تعلیم دی بلکہ اس نے عملی طور پر ایک ایسا سماج بنایا جو تاریخ کے کسی بھی پچھلے سماج سے زیادہ بے رحمی اور اجتماعی ظلم سے پاک تھا:

"They created a society more free from widespread cruelty and social oppression than any society had ever been in the world before." (p. 325)

مشہور ہندو مصلح سوامی ویویکانند نے لکھا ہے کہ اگر کوئی مذہب کبھی قابل لحاظ حد تک عملی مساوات کے درجے کو پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے:

"My experience is that if ever any religion approached to this equality in an appreciable manner, it is Islam and Islam alone." (Letters of Swami Vivekananda, p. 379)

اسلام کے اس عملی پہلو نے اس کو اجارہ داری کی حد تک صداقت کا حامل بنا دیا ہے۔ آج کا انسان اخوت اور مساوات اور انصاف کی بنیاد پر جو انسانی سماج بنانا چاہتا ہے اس کے

لیے ساری معلوم تاریخ میں عملی نمونہ صرف ایک ہے اور وہ اسلام کا نمونہ ہے۔ اقوام متحدہ کا ڈکلریشن آف ہیومن رائٹس موجودہ حالت میں صرف ایک لفظی یوٹوپیا ہے، کیوں کہ اس کے پیچھے کوئی عملی نمونہ موجود نہیں۔ مگر اسلامی تعلیمات کی پشت پر ایک معلوم مثالی تاریخ ہے جو ان تعلیمات کو عملی نمونہ کے روپ میں پیش کر رہی ہے۔ یہ نمونہ انسان کو یقین دلاتا ہے کہ اعلیٰ اخلاقی تعلیمات قابلِ عمل بھی ہیں، نہ کہ محض لفظی خیال آرائی۔

مادی مذہب کی ناکامی

قدیم زمانے میں مذہب کو مقدس سمجھنے کی وجہ سے اس کے بارے میں تحقیق وتنقید کا ذہن پیدا نہ ہو سکا۔ موجودہ زمانے میں جب ذہنی آزادی آئی تو دوسری تمام چیزوں کی طرح مذہب کو بھی تحقیق کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ مذہب کے آزادانہ مطالعہ کے لیے نئے نئے علوم پیدا ہو گئے۔ مثلاً تنقید عالیہ (higher criticism) اور تنقید متن (textual criticism) اور تاریخی تنقید (historical criticism)، وغیرہ۔ ان مطالعات سے معلوم ہوا کہ (اسلام کے سوا) تمام مذاہب اپنی موجودہ شکل میں سرے سے قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔

اب ایک نیا "مذہب" وجود میں آیا جس کو مادیت (materialism) کہا جاتا ہے۔ فلسفیانہ اعتبار سے مادیت اس نظریہ کا نام تھا کہ ہر چیز جو اپنا وجود رکھتی ہے وہ اپنی نوعیت میں مادی ہے:

> "The theory that everything that really exists is material in nature."

اس فلسفیانہ تصور سے جو عملی نظریہ نکلا وہ یہ تھا کہ مادی خوشی حاصل کرنا ہی انسان کا اصل مقصد ہے۔ آدمی کو زیادہ سے زیادہ مادی اسباب حاصل کرنا چاہیے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کر سکے۔ مگر یہ نظریہ فکری اور عملی دونوں اعتبار سے ناکام ہو گیا۔

فکری سطح پر اس کا اظہار مادی سائنس تھی۔ سائنس کے میدان میں انسان نے تلاش و جستجو شروع کردی۔ اس کو یقین تھا کہ سائنس کے ذریعے وہ تمام حقیقتوں کو آخری حد تک جان لے گا۔ مگر سائنس کے میدان میں انسان کی تلاش نے اس کو صرف مایوسی تک پہنچایا۔ سائنسی ذرائع کی محدودیت حقیقتِ کلّی کی دریافت کے لیے انتہائی حد تک ناکافی ثابت ہوئی۔

سر جیمز جینز اپنی کتاب سائنس کا نیا پس منظر میں لکھتے ہیں کہ طبیعیاتی سائنس مادہ اور ریڈئیشن کی دنیا کا مطالعہ کرنے کے لیے اٹھی۔ مگر اس نے پایا کہ وہ دونوں میں سے کسی کی بھی نہ تصویر کشی کرسکتی اور نہ اس کی نوعیت کو بیان کرسکتی۔ فوٹان اور الیکٹران اور پروٹان طبیعیات داں کے لیے اتنے ہی بے معنی ہیں جیسا کہ الجبرا سیکھنے کے پہلے دن ایک چھوٹے بچے کے لیے ایکس، وائی، زیڈ۔ اس وقت ہم زیادہ سے زیادہ جس چیز کی امید کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم ایکس، وائی، زیڈ کو بڑھائیں بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ فی الحقیقت کیا ہیں:

"Physical science sets out to study a world of matter and radiation and finds that it cannot describe or picture the nature of either, even to itself. Photons. electrons and protons have been found as meaningless to the physicist as x.y.z are to a child on its first day of learning algebra. The most we hope for at the moment is to discover ways of manipulating x,y,z without knowing what they are." (*The New Background of Science*, Cambridge, 1933, p.5)

سائنس کی ترقی نے، باعتبار نتیجہ صرف انسان کے احساس بے علمی میں اضافہ کیا ہے یہاں زیادہ جاننا صرف کم جاننے کو ثابت کررہا ہے۔ آئن سٹائن نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کیا کہ موجود سائنس کی حقیقت ایک ناقابل فہم سے دوسرے ناقابل فہم کو اخذ کرنا ہے:

"Extracting an incomprehensible from another incomprehensible." (*The New Background of Science*, p.5)

ناکامی کا یہی تجربہ عملی اعتبار سے بھی پیش آیا ہے۔ جدید حالات نے انسان کو موقع دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمائے۔ وہ زیادہ سے زیادہ سازو سامان جمع کر سکے۔ جدید انسان نے پورے جوش وخروش کے ساتھ اس کے لیے جدو جہد شروع کردی۔ مگر دولت کے انبار اور راحت کے سامانوں کے ڈھیر جمع کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ چیزیں آخر کار اس کو جہاں پہنچاتی ہیں وہ صرف اکتاہٹ (boredom) ہے۔ ہر قسم کے مادی اسباب فراہم کرنے کے باوجود انسان کو حقیقی سکون حاصل نہ ہو سکا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے جب دولت کمانے کے عالمی امکانات کھول دیے اور راحت کے نئے نئے سامانوں سے بازار جگمگا اٹھے تو انسان نے سمجھا کہ وہ دنیا ہی میں اپنا عیش خانہ بنا سکتا ہے۔ اب اس کو آخرت کی جنت کی ضرورت نہیں۔ مگر انسان اس کو بھول گیا کہ اس کے حوصلوں کی راہ میں طرح طرح کی حد بندیاں (limitations) اور ناخوش گواریاں (disadvantage) حائل ہیں۔ چنانچہ دولت اور سامان کا انبار جمع کرنے کے بعد بھی سچا سکون اور سچی خوشی انسان کو حاصل نہ ہو سکی۔

1989 میں امریکہ میں 358 صفحات پر مشتمل ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کا تعلق امریکہ کے اعلیٰ ترین دولت مندوں سے ہے:

The Ultra Rich, by Vance Packard. New York

اس کتاب میں امریکہ کے تیس ایسے بڑے دولت مندوں کے احوال درج ہیں جن کی دولت 1987 میں 465 ملین ڈالر یا اس سے زیادہ تھی، مصنف نے ان تمام دولت مندوں سے ذاتی طور پر انٹرویو لیا۔ انہوں نے پایا کہ ان میں سے ہر شخص بے اطمینانی کا شکار تھا۔ ان لوگوں کے پاس اتنے بڑے بڑے مکانات ہیں کہ ان کے احاطے میں 707 بوئنگ جہاز اتر سکتا ہے۔ مگر ایک دولت مند کے الفاظ میں، اس کے گھر کا وسیع چمن اس کو ایک قسم کا سر

سبز پنجرہ (verdant cage) معلوم ہوتا ہے۔ ایک دولت مند نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں دولت کے اس انبار کو کیا کروں:

"I didn't know what the hell to do with it." (p.43)

"مادی مذہب" کے بارے میں اس قسم کے تجربات نے جدید انسان کو مادی مذہب کی طرف سے بے یقینی میں مبتلا کر دیا ہے۔ مادیت نہ فکری سطح پر انسان کو اس کے سوالات کا جواب دے سکی اور نہ عملی سطح پر اس کو وہ سکون دے سکی جو اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔ محرف مذہب اور مادی مذہب دونوں سے بیزار ہو کر انسان اب ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں اس کے لیے آخری چارہ کار صرف یہ ہے کہ وہ غیر محرف مذہب کا تجربہ کرے۔ وہ بگڑے ہوئے مذاہب اور خودساختہ ازموں (isms) کو چھوڑ کر خدا کے سچے دین کے سایے میں آجائے۔

اس قسم کے بے شمار پہلو ہیں جن میں سے چند کو میں نے نہایت اختصار کے ساتھ یہاں بیان کیا ہے۔ یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ جدید حالات اور جدید فکری انقلاب نے آج کے انسان کو کس طرح عین اسلام کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ آج تمام انسان مجہول طور پر اسی طرح اسلام کے طالب بن چکے ہیں جس طرح قدیم زمانہ جاہلیت میں حنفاء اسلام کے مجہول طالب بنے ہوئے تھے۔

اس صورت حال نے دعوت کے لیے نئے وسیع تر امکانات کے دروازے کھول دیے ہیں۔ اگر ان نئے امکانات کو درست طور پر استعمال کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اکیسویں صدی اسلام کی صدی ثابت ہوگی۔

داعیانہ جذبہ

آخر میں ایک واقعہ نقل کرنا چاہتا ہوں جو اس معاملے میں ہمارے لیے مہمیز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ واقعہ مرے گل مان کا ہے جو ایک امریکی سائنس داں ہے اور جس کو 1969

میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا:

"Winner of the 1969 Nobel Prize for Physics for his work in bringing order to man`s knowledge of the seemingly chaotic profusion of subatomic particles." (*Encyclopedia Britanicca*, IV/453)

مرے گل مان کو جب وہ دریافت ہوئی جس پر اس کو نوبیل انعام کا مستحق سمجھا گیا تو اس کے اندر اس بات کی بے پناہ تڑپ جاگ اٹھی کہ وہ اپنی اس دریافت سے لوگوں کو باخبر کرے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک انوکھی تدبیر کی۔ اس نے امریکہ کے ایک شہر آسپن (Aspen) میں کیبرے کی ایک تقریب کا انتظام کیا۔ اور اس میں تعلیم یافتہ لوگوں کو مدعو کیا۔ لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوئے۔ تقریب شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد ایک دھما کہ خیز واقعہ ہوا۔ جو رپورٹر کے الفاظ میں یہ تھا:

"Near the end of the show, physicist Murray Gell-Mann jumped up from the audience, dashed to the stage and exclaimed, "Stop everything. I have to explain to you the theory of the universe. I understand how everything works." (p.36)

کیبرے شو کے آخر میں فزکس کا عالم مرے گال مان حاضرین کے درمیان سے کود کر نکلا۔ وہ تیزی سے اسٹیج تک پہنچا اور چلّا کر کہا۔ ہر چیز کو روک دو۔ مجھے آپ لوگوں کے سامنے کائنات کے نظریہ کی وضاحت کرنی ہے۔ میں نے یہ جان لیا ہے کہ ہر چیز کس طرح عمل کرتی ہے۔

کسی آدمی پر ایک بڑی حقیقت کا انکشاف ہو جائے تو وہ اس کا تحمّل نہیں کر سکتا کہ وہ اس کا اعلان نہ کرے۔ وہ ہر قیمت پر اس کا اعلان کرے گا۔ اس وقت تک اس کو چین نہیں آئے گا جب تک وہ دنیا والوں کو اس سے باخبر نہ کر دے۔ دریافت ایک بھونچال ہے۔ دریافت آدمی کو داعی بنا دیتی ہے۔

یہی معاملہ اسلامی دعوت کا بھی ہے۔ اگر ہم کو اس حقیقت کا واقعی شعور ہو جائے کہ آج دنیا کی قومیں کہاں پہنچ چکی ہیں۔ اور اسلام کی دعوت کو عام کرنے کے کتنے زیادہ امکانات پیدا ہو چکے ہیں تو ہم لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے بے تاب ہو جائیں گے۔ ہمارا حال مزید شدت کے ساتھ وہی ہو جائے گا جو مرے گل مان کا ہوا۔ ہم کود کر لوگوں کے سامنے آ جائیں گے، اور پکار اٹھیں گے کہ ہر کام کو بند کر کے میری بات سنو، کیوں کہ میرے پاس تم کو سنانے کے لیے وہ اہم ترین پیغام ہے جس کی آج تمہیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ جس کے بغیر تمہاری دنیا بھی برباد ہے اور تمہاری آخرت بھی برباد۔

پیغمبرانہ رہنمائی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اتنی زیادہ ہے کہ غیر مسلم مؤرخین ومحققین بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ مثلاً سرٹامس کارلائل نے آپ کو پیغمبروں کا ہیرو (Hero as prophet) قرار دیا ہے۔ پروفیسر ای ای کلیٹ (E.E.Kellett) نے آپ کی بابت لکھا ہے کہ انھوں نے مصائب کا مقابلہ اس عزم کے ساتھ کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑ یں:

> "He faced adversity with the determination to wring success out of failure." (*A Short History of Religions* by E.E. Kellet, pp. 331-32, Middlesex)

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ (Michael Hart) نے اپنی کتاب سو بڑے (The 100) میں آپ کو عالمی بڑوں کی فہرست میں نمبر ایک پر رکھا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ تاریخ کے واحد شخص ہیں جو مذہبی اور دنیاوی دونوں لحاظ سے سب سے زیادہ کامیاب رہے:

> "He was the man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

یہ پیغمبرِ اسلام کی تصویر ہے۔ لیکن امّتِ اسلام کو دیکھیے تو اس کی تصویر اس سے بالکل مختلف نظر آئے گی۔ ہیرو پیغمبر کی امت آج زیرو امت بنی ہوئی ہے۔ پیغمبرِ کامیاب کی امت موجودہ زمانے میں امتِ ناکامیاب کا بدترین نمونہ ہے۔ وہ ہستی جس کا حال یہ تھا کہ اس نے ناکامی تک سے کامیابی کو نچوڑ لیا۔ اس کے ماننے والے آج ساری دنیا میں صرف اپنی عبرت ناک محرومی کے خلاف فریاد خوانی اور ماتم سرائی میں مشغول ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کا جواب معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔ آپ مسلمانوں کے سیرۃ النبیؐ کے جلسوں میں شرکت کیجیے۔ آپ مسلم اخبارات و جرائد کے سیرت نمبر کو دیکھیے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے سیرت رسولؐ کے موضوع پر جو بے شمار کتابیں لکھی ہیں، ان کا مطالعہ کیجیے۔ ان کا خلاصہ، تقریباً بلا استثناء صرف ایک نکلے گا، اور وہ فخر ہے۔ مسلمانوں نے اپنے رسولؐ کو اپنے لیے ایک قسم کا قومی فخر بنالیا ہے، اور مختلف طریقوں سے اس کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ہمارے لیے بطور فخر نہیں بھیجے گئے، بلکہ آپ بطور نمونہ بھیجے گئے۔ قرآن میں کہا گیا ہے:

> لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (33:21) سارے قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ مَفخَرَةٌ حَسَنَةٌ۔ (اللہ کے رسول میں تمہارے لیے بہترین فخر ہے) مسلمانوں کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ قرآن کی کسی آیت کو بدل دیں۔ چنانچہ قرآنی مصحف میں تو اب بھی یہی لفظ درج ہے کہ اللہ کے رسولؐ میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ مگر مسلمانوں کی اپنے عمل کی جو کتاب ہے اس میں انہوں نے بطور خود یہ لکھ دیا ہے کہ اللہ کے رسولؐ میں تمہارے لیے بہترین فخر ہے۔

یہی اصل سبب ہے جس نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو ناکام بنا رکھا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ رسول اللہؐ کا اتنا زیادہ تذکرہ کرتے ہیں، مگر عملی طور پر اس کا کوئی فیض ان کے حصے میں نہیں آتا۔ اگر آپ کے پاس نہایت زرخیز قسم کی ایک ہزار ایکڑ زمین ہو، مگر آپ اس پر کاشت نہ کریں۔ البتہ صبح و شام اس پر فخر کرتے رہیں تو وہ زمین آپ کو کچھ بھی فائدہ دینے والی نہیں۔ زمین کا فائدہ آپ کو اس وقت حاصل ہوگا جب کہ آپ اس کو استعمال کریں۔

اسی طرح رسولؐ پر فخر کرنا مسلمانوں کے کچھ کام آنے والا نہیں۔ البتہ اگر وہ رسول کو نمونۂ عمل سمجھیں، اور آپ کے طریقے کو اپنی زندگی میں عملاً اختیار کریں تو یقیناً وہ ان عظیم فائدوں اور برکتوں کو حاصل کر سکتے ہیں جو اس نمونے کے اندر رکھے گئے ہیں۔

اعلیٰ کامیابی کا راز

مذکورہ امریکی کتاب (The Hundred) کا مسلمانوں میں بہت چرچا ہے جس میں پیغمبر اسلام کو سب سے زیادہ کامیاب انسان (supremely successful) قرار دیا گیا ہے۔ اس مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ان کے جذبۂ فخر کو تسکین ملتی ہے۔ مگر قرآن کے نقطۂ نظر سے اصل اہمیت کی چیز آپ کا اسوہ ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو ہمیں "سپریملی سکسس فل" سے زیادہ یہ دیکھنا چاہیے کہ آپ کی سپریم سکسس (supreme success) کا راز کیا تھا۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی اصل کمی یہ ہے کہ انہوں نے پیغمبر اسلام کو فخر کے طور پر جانا، مگر انہوں نے آپ کو اسوہ کے طور پر نہیں جانا۔ وہ سپریملی سکسس فل پیغمبر کو جانتے ہیں، مگر وہ اس پیغمبر سے واقف نہیں جس نے اپنی کامل زندگی کے ذریعے سپریم سکسس کا راز بتایا ہے۔ یہ فرق اتنا زیادہ واضح ہے کہ وہ موجودہ زمانے کے کسی بھی مسلمان کی تقریر کو سن کر یا اس کی تحریر کو پڑھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے یکم اکتوبر 1980 کو اقوام متحدہ (نیویارک) کی جنرل اسمبلی میں ایک تقریر کی تھی۔ اس تقریر کو انہوں نے دنیا بھر کے 90 کروڑ مسلمانوں کے دل کی آواز بتایا تھا۔ یہ تقریر مسلم حلقوں میں عام طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔ اس تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ اسلامی قوموں نے موجودہ زمانے میں اپنے مذہب اور کلچر میں اپنے فخر کو دوبارہ دریافت کیا ہے:

“The Islamic peoples have rediscovered their pride in their religion and their great culture.”

موجودہ زمانے کی مسلم بیداری کے لیے یہ صحیح ترین لفظ ہے۔ انہوں نے اسلام کو بطور فخر دریافت کیا ہے، نہ کہ بطور ہدایت۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے تقریروں، تحریروں اور دوسری صورتوں میں جو "اسلامی سرگرمیاں" دکھائی ہیں، وہ تقریباً سب کی سب فخر (pride) کے جذبے کے تحت ابھری ہیں، وہ اتباع کے جذبے کے تحت نہیں ابھریں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نام پر ان کی تمام سرگرمیاں محض نمائشی دھوم بن کر رہ گئیں، وہ ان کے حال کو بدلنے کے معاملے میں مؤثر ثابت نہ ہوسکیں۔ کیوں کہ اسلام کی برکتیں اسلام پر عمل کرنے سے ظاہر ہوں گی، نہ کہ اسلام پر فخر وناز کرنے سے۔

صراط مستقیم

قرآن کی سورہ نمبر 48 معاہدہ حدیبیہ کے فوراً بعد اتری۔ اس سورہ کا نام الفتح ہے اور اس کی ابتدائی تین آیتیں یہ ہیں:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۔ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا۔ (48:1-2) یعنی، بے شک ہم نے تم کو کھلی فتح دے دی۔ تا کہ اللہ تمہاری اگلی اور پچھلی خطائیں معاف کردے۔ اور تمہارے اوپر اپنی نعمت کی تکمیل کرے، اور تم کو سیدھا راستہ دکھائے، اور تم کو زبردست مدد عطا کرے۔

قرآن کی ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے ہماری رہنمائی ایک ایسی صراط مستقیم کی طرف کی ہے جس میں نہ صرف نجات اور مغفرت کی بشارت ہے۔ بلکہ موجودہ دنیا میں بھی یہ صراط مستقیم اس بات کی ضامن ہے کہ اگر اہل ایمان اس کو پوری طرح اختیار کرلیں تو وہ خدا کی نصرتِ خاص کے مستحق قرار پائیں اور دوسروں کے

مقابلے میں انہیں یقینی طور پر فتح وغلبہ حاصل ہو۔

ایمانی حوصلہ

خدائی صراطِ مستقیم جو پیغمبر کے ذریعے کھولی گئی ہے، اس کا پہلا اور بنیادی جزء ایمان باللہ ہے۔ اللہ پر ایمان کسی قسم کے تلفّظِ کلمہ کا نام نہیں، یہ ایک عظیم ترین حقیقت پر گہرے یقین کا نام ہے جو آدمی کے اندر زبردست ذہنی انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔

خدا اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ لامحدود علم اور لامحدود طاقت والا ہے۔ وہ ہر قسم کے صفاتِ کمال کا ابدی خزانہ ہے۔ ایسے خدا پر ایمان لانا گویا طاقتور ترین ہستی کو اپنی حمایت پر کھڑا کر لینا ہے۔ یہ احساس آدمی کو ایسا برتر حوصلہ دیتا ہے جو کبھی مایوسی کا شکار نہ ہو، جو کبھی زیر ہونے پر راضی نہ ہو سکے۔ جو نازک ترین لمحات میں بھی ہمت اور عزم کو نہ کھوئے۔

ایمان آدمی کو کیسا اتھاہ حوصلہ دیتا ہے، اس کا ایک اعلیٰ نمونہ پیغمبرِ اسلام کا وہ واقعہ ہے جو غار ثور میں پیش آیا۔ مکہ والے اسلام کے دشمن ہو گئے۔ حتیٰ کہ انہوں نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت آپ خاموشی کے ساتھ مکہ سے نکل کر مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اہل مکہ کو جب معلوم ہوا تو وہ راستوں کی طرف دوڑے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ غار ثور کے منہ تک پہنچ گئے۔ اس وقت آپ کے ساتھی حضرت ابوبکر کی زبان سے نکلا کہ وہ تو یہاں بھی آ گئے۔ آپ نے نہایت پرسکون لہجے میں فرمایا: يَا أَبَا بَكْرٍ مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2381) یعنی، اے ابوبکر، ان دو کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلمہ بلا شبہ انسانی حوصلے کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اور یہ اعلیٰ مثال تاریخِ انسانی میں جس چیز نے قائم کی، وہ ایمان باللہ تھا۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ایمان

باللہ میں کس طرح یہ عظیم طاقت ہے کہ وہ نازک ترین لمحات میں بھی انسان کو بے حوصلہ ہونے سے بچائے۔ وہ آخری حد تک اس کو عزم وہمت کے بلند معیار پر قائم رکھے۔

قدیم عرب کی تاریخ کا ایک سال وہ ہے جو عام الفیل (571ء) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وہ سال ہے جب کہ یمن کا عیسائی حکمران ابرہہ 60 ہزار آدمیوں کا لشکر اور ایک درجن ہاتھی لے کر مکہ کی طرف بڑھا تا کہ کعبہ کو ڈھا کر اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ اہل عرب کے لیے اس وقت ہاتھیوں کا تصور بڑا بھیانک تھا۔ چنانچہ ہاتھیوں کی فوج کی خبر سن کر مکہ کی اکثریت شہر چھوڑ کر پہاڑوں اور وادیوں میں جا کر چھپ گئی ان کو یہ بات ناقابل تصور معلوم ہوئی کہ وہ ایک ایسی فوج کا مقابلہ کریں جس میں "متحرک چٹانیں" انسانوں کو کچلنے کے لیے آگے آگے چل رہی ہوں۔

اس واقعہ (571ء) کے ستر سال بعد 642ء میں انہیں عربوں کا مقابلہ ایرانیوں کے ساتھ پیش آیا۔ دریائے فرات کے کنارے ایرانیوں کا لشکر اس طرف صف آرا ہوا کہ ان کے آگے سو سے بھی زیادہ جنگی ہاتھی کالے دیو کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ ان ہاتھیوں کو دیکھ کر عربوں کے گھوڑے بدکنے لگے۔ اس وقت بہت سے عرب فوجی اپنے گھوڑوں کی پیٹھوں سے کود پڑے۔ انھوں نے اپنی تلوار کے ذریعے ہاتھیوں پر حملہ کر دیا اور ان کی سونڈیں کاٹ ڈالیں۔ اس کے بعد ہاتھیوں کی صفیں ٹوٹ گئیں۔ وہ چیختے ہوئے پیچھے کی طرف بھاگے۔ اور خود ایرانی فوجیوں کو اپنے بھاری قدموں کے نیچے روند ڈالا۔

571ء کے عرب اور 642ء کے عرب کے درمیان یہ فرق کیسے پیدا ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عظیم فرق ایمان باللہ کی طاقت نے پیدا کیا۔ 571ء کے عرب مشرکانہ عقیدہ میں جی رہے تھے۔ 642ء کے عربوں کو پیغمبر اسلام نے توحید کے عقیدہ پر کھڑا کر دیا تھا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے پہلے انسان اور بعد کے انسان میں اتنا بڑا فرق پیدا کر دیا۔

فطرت سے مطابقت

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۔(2:249)

اس آیت میں ''اذن'' کا لفظ آیا ہے۔ عربی میں اس کے معنی اجازت ہیں۔ آیت بتاتی ہے کہ چھوٹا گروہ بھی بڑے گروہ پر غالب آسکتا ہے، بشرطیکہ اس کو خدا کا اذن حاصل ہو جائے۔ یہ اذنِ خداوندی کس کو ملتا ہے، اس کا جواب خود آیت کے اگلے حصے میں موجود ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ یہ اذن ان لوگوں کو ملتا ہے جو صبر کا ثبوت دیں۔

اس دنیا میں تمام واقعات فطرت کے قانون کے تحت پیش آتے ہیں۔ آدمی اگر اپنے حصے کی ذمہ داری کو انجام دیتا رہے، اور جلد بازی کا شکار نہ ہو تو فطرت کا عمل اپنے وقت پر پورا ہوتا ہے اور اس کو کامیابی تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ صبر نہ کرے اور نتیجہ کو جلد دیکھنے کے لیے قبل از وقت کوئی کارروائی کر بیٹھے تو گویا اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ناکام بنالیا۔

ایک مثال اس معاملے کو بہت اچھی طرح واضح کرتی ہے۔ ایک شخص اپنے گھر کے اندر ایک درخت لگانا چاہتا تھا۔ اگر وہ بیج کو زمین میں ڈال کر دس سال تک انتظار کرتا تو وہ اپنے گھر میں ایک ہرا بھرا درخت دیکھنے کی خوشی حاصل کرسکتا تھا۔ مگر اس نے دس سال کا سفر ایک دن میں طے کرنا چاہا۔ چنانچہ اس نے باہر سے ایک بڑا درخت کھدوایا اور اس کو لا کر اپنے گھر میں جما دیا۔

چند دن کے بعد اس کا درخت سوکھ گیا۔ وہ اپنے گھر میں اداس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں اس کا ایک دوست اس سے ملنے کے لیے آیا۔ دوست نے اپنے ساتھی کو اداس دیکھ کر پوچھا

کہ کیا بات ہے، آج تم اداس دکھائی دے رہے ہو۔ آدمی نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ میں جلدی میں ہوں مگر خدا جلدی نہیں چاہتا:

“I am in hurry, but God isn't.”

درخت کے لیے خدا کا اذن یہ ہے کہ پہلے ایک زرخیز زمین فراہم کی جائے۔ اس کو تیار کرکے اس میں بیج ڈالا جائے۔ پھر نشوونما کی مقررہ مدت تک اس کا انتظار کیا جائے۔ (الاعراف، 7:58) اس اذن خداوندی سے موافقت کے بغیر کوئی شخص درخت کا مالک نہیں بن سکتا۔ مذکورہ شخص کی غلطی یہ تھی کہ اس نے درخت کے معاملے میں خدا کے اذن کا لحاظ نہ کیا، اس لیے وہ درخت بھی حاصل نہ کرسکا۔

اسی طرح زندگی کے معاملے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے صبر کا اصول مقرر کیا ہے۔ آدمی اگر چاہتا ہے کہ وہ حقیقی کامیابی حاصل کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے دائرے اور امکان کے اعتبار سے اپنے عمل کا آغاز کرے اور بحیثیت انسان کے اس کی جو ذمہ داریاں ہیں، ان کو ادا کرنے میں لگ جائے۔ جب وہ ایسا کرے گا تو اس کے فوراً بعد فطرت کے اسباب بھی اس کے حق میں جمع ہونا شروع ہوجائیں گے۔ اب اگر اس نے اسباب فطرت کی تکمیل سے پہلے کوئی اقدام کردیا تو وہ ناکام رہے گا، اور اگر اس نے اس وقت تک انتظار کیا جب کہ فطرت کے اسباب اس کے حق میں جمع ہوجائیں تو وہ کامیاب رہے گا۔

یہی وہ بات ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن میں اس طرح کہی گئی ہے کہ (اپنے دعوتی عمل کو جاری رکھتے ہوئے تم نتیجے کے بارے میں) صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی نہ کرو۔ فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّهُمۡ۔ (46:35)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی ایک مثال مکی دور اور مدنی دور کا معاملہ

ہے۔مکی دور میں مسلمانوں پر ظلم ہورہا تھا۔اوران کو ستایا جارہا تھا۔مگر مسلمانوں کے مطالبے کے باوجود انہیں ظالموں کے مقابلے میں دفاع کی اجازت نہیں دی گئی۔انہیں یہ حکم دیا گیا کہ تم یک طرفہ صبر کرتے رہو۔(یونس،10:109) البتہ مدینہ پہنچنے کے بعد انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ ظالموں کے مقابلے میں دفاع کرسکتے ہیں۔(الحج،22:39)

اس کی وجہ یہ تھی کہ مکہ میں ابھی عملِ دعوت اس تکمیلی حد کو نہیں پہنچا تھا جس کو اتمام حجت کہا جاتا ہے۔اس بنا پر ایسا نہیں ہوا تھا کہ مخالف گروہ کے تمام صالح افراد کٹ کر نکل آئیں اوراس کے غیر صالح عناصر اپنے انکار پر مصر رہنے کی بنا پر خدا کی پکڑ کے مستحق بن جائیں۔ جب یہ دعوتی حد آخری طور پر پوری ہوگئی اور اتمام حجت کے باوجود انکار کے نتیجے میں اہل کفر خدا کی پکڑ کے مستحق قرار پا گئے،اس وقت ان سے ٹکرانے کی اجازت دے دی گئی۔

اس معاملے کی ایک مثال وہ ہے جو ہندستان میں صوفیوں اور لیڈروں کے تقابل سے سامنے آتی ہے۔ ہندستان کے مسلم معاشرے میں، 1947 سے پہلے، صوفیوں کا غلبہ تھا، 1947 کے بعد یہاں کے مسلم معاشرہ پر لیڈروں کا غلبہ ہے۔دونوں زمانوں کا مطالعہ کیجیے تو ان میں ایک بے حد نمایاں فرق نظر آئے گا۔پچھلے دور میں لاکھوں کی تعداد میں ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔موجودہ دور میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔اشاعت اسلام کا عمل جو پچھلے دور میں پورے تسلسل کے ساتھ جاری تھا، وہ اب ہر طرف رکا ہوا نظر آتا ہے۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ موجودہ لیڈر اسلام کی تبلیغ نہیں کرتے، اور صوفیاء اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ صوفیاء نے یہاں تبلیغ کا باقاعدہ عمل کیا ہو۔صوفیاء کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فطرت کو اپنا کام کرنے کا موقع دیا، جب کہ موجودہ لیڈر فطرت کو اپنا کام کرنے کا موقع نہیں دے رہے ہیں۔

صوفیاء کا دین محبت تھا۔ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مختلف فرقوں کے درمیان اچھے

تعلقات قائم کریں۔ اس طرح وہ انسان کو موقع دیتے تھے کہ وہ اپنے فطری راستے پر بے روک ٹوک آگے بڑھ سکے۔ اب چونکہ اسلام اور انسانی فطرت دونوں ایک ہیں، اس لیے فطرت کا سفر ہمیشہ اسلام کی منزل پر ختم ہوتا تھا۔ لوگ اپنے آپ اسلام کی طرف راغب ہوتے اور پھر صوفیاء کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیتے۔ اس طرح کسی براہ راست تبلیغ کے بغیر اسلام فطرت کے زور پر اپنے آپ پھیلتا جا رہا تھا۔

موجودہ مسلم لیڈروں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ نفرت اور رقابت کے دین پر کھڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے حکومت (یا ہندو) کے خلاف کچھ نزاعی اشو اٹھا رکھے ہیں اور ان کے نام پر منفی دھوم مچاتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ سرگرمیاں دونوں فرقوں میں نفرت اور تعصب کی آگ بھڑکا کر دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر رہی ہیں۔ یہی نفرت اور تعصب کا ماحول ہے جس نے موجودہ زمانے میں فطرت کو اپنا عمل کرنے سے روک دیا ہے۔ اسلام کا سیلاب جو صوفیاء کے زمانے میں روانی کے ساتھ جاری تھا، وہ موجودہ ہندستان میں ہر طرف رکا ہوا نظر آتا ہے۔

انقلابی زاویۂ نظر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے بارے میں جو نقطۂ نظر دیا، وہ ایسا نقطۂ نظر ہے جو آدمی کو سراپا عمل بنا دیتا ہے۔ وہ آدمی کی صلاحیتوں کو جگا کر اس کو حالات کے مقابلے میں ناقابل تسخیر بنا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو (اور ان کی ذریت کو) زمین پر آباد کیا تو ان سے فرمایا کہ تم لوگ زمین پر بسو، اور تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو گے: قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۔(7:24)

اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انسان درختوں اور پتھروں کی

مانند نہیں رہے گا۔ بلکہ وہ متحرک اور متصادم مخلوق کی مانند رہے گا۔ یہاں انسانوں کے باہمی تعلقات مسابقت (competition) کی بنیاد پر قائم ہوں گے۔ یہاں ایک انسان اور دوسرے انسان، ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان ٹکراؤ پیش آئے گا۔ اس کے نتیجے میں آخری طور پر یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ آپس میں دشمنیاں قائم ہوں گی۔ اس نظام تخلیق کا پہلا مظاہرہ ہابیل اور قابیل کے خونی نزاع کی صورت میں پیش آیا، اور اب تک وہ مختلف شکلوں میں بنی آدم کے درمیان جاری ہے۔

اس نظامِ تخلیق کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ دنیا میں آدمی کو چیلنج کے حالات میں رہنا ہوگا۔ اس دنیا میں کسی کو عمل کا بے ضرر اور ہموار میدان نہیں ملے گا۔ یہاں افراد اور قوموں کو رکاوٹوں اور مخالفتوں، حتیٰ کہ دشمنیوں کے درمیان زندگی کا سفر طے کرنا پڑے گا۔ گویا دنیا کی زندگی آدمی کے فکر وعمل کا امتحان ہوگی۔ جو شخص خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کرے گا، وہ کامیاب ہوگا۔ اور جو لوگ خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال نہ کرسکیں، وہ اس دنیا میں کامیابی کو بھی حاصل کرنے میں ناکامیاب ثابت ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی دنیا میں خدا نے مقابلہ اور مسابقت کا وہی نظام قائم کیا ہے جو حیوانات کے درمیان بڑے پیمانے پر رائج ہے۔ حیوانات کی دنیا میں یہ نظام ہے کہ ہرن کے پیچھے بھیڑیا دوڑ رہا ہے۔ اگر بھیڑیا اس طرح نہ دوڑے تو ہِرن اپنے جوہر حیات کو کھودے گا۔ یہاں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کا پیچھا کر رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مچھلیوں کی نشوونما کا عمل رک جائے۔ اسی طرح انسانی زندگی میں بھی تمام ترقیاں مقابلہ اور مسابقت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر زندگی میں مقابلہ اور مسابقت کا ماحول باقی نہ رہے تو ہر قسم کی ترقیوں کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

سیرت کی روایتوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد مکہ سے

طائف کا سفر فرمایا۔ درمیان میں ایک راستہ ملا جو بظاہر تنگ اور دشوار تھا۔ آپ نے پوچھا کہ اس راستے کا نام کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ الضَّيْقَةُ (تنگ) آپ نے فرمایا کہ نہیں، وہ آسان ہے (بَلْ هِيَ الْيُسْرَى) سیرت ابن ہشام، جلد 4، صفحہ 127۔

مذکورہ راستہ بطور واقعہ تنگ تھا۔ مگر اس کے باوجود آپ نے اس کو آسان راستہ قرار دیا۔ اس طرح آپ نے بتایا کہ زندگی ایک امتحان ہے۔ یہاں بہر حال تنگی اور دشواری پیش آئے گی۔ تمہارا کام یہ نہیں ہے کہ دشواری کو دشواری کہہ کر اپنے آپ کو بے حوصلہ کرلو، یا اس کے خلاف فریاد واحتجاج کرنے لگو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم تنگی کو کشادگی میں مُبدّل (convert) کرو۔ تم مشکل کو آسان بنا کر اس کے اوپر فتح حاصل کرو۔ تمہارا سوچنے کا طریقہ انقلابی ہونا چاہیے، نہ کہ احتجاجی۔

یہ وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے کے بعض مفکرین نے مسئلہ کا برتر حل (superior solution) کا نام دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی پوری زندگی اسی برتر تدبیر کی اعلیٰ مثال ہے۔ آپ کو عرب میں سخت ترین مشکلوں سے سابقہ پیش آیا۔ مگر آپ نے ان مشکلوں کو چیلنج کے روپ میں دیکھا۔ آپ نے دشواریوں کو اپنے لیے زینہ بنا کر ان کے اوپر فتح حاصل کی۔

مکہ کے اہل شرک نے آپ کے لیے اور آپ کے اصحاب کے لیے مکہ میں رہنا مشکل بنا دیا۔ آپ نے اس ناموافق صورت حال کو اپنے لیے موافق صورت حال میں تبدیل کرلیا۔ ایک طرف آپ نے اپنے سَو سے کچھ اوپر اصحاب کو، جو سب کے سب داعیانہ جذبہ رکھتے تھے، سمندر پار حبش کے ملک میں بھیج دیا۔ اس طرح آپ کی دعوت ایشیا سے نکل کر افریقہ میں داخل ہوگئی۔ ایک دعوت جو ابھی تک صرف مقامی حیثیت رکھتی تھی، وہ بین اقوامی دعوت کی صورت اختیار کرگئی۔

دوسری طرف آپ نے اپنے کچھ ساتھیوں کو مدینہ (یثرب) روانہ کیا۔ وہاں دعوت

کے ذریعے لوگ بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد آپ خود بھی مکہ سے نکل کر مدینہ چلے گئے اور مدینہ کو مرکز بنا کر اپنا دعوتی کام مزید شدت کے ساتھ جاری کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اولاً مدینہ اور اس کے بعد پورا ملک اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گیا۔

موجودہ زمانے میں تاریخ کے وسیع تر مطالعہ نے اس نظریہ کے حق میں مزید تصدیق فراہم کی ہے۔ مثال کے طور پر آرنلڈ ٹوائن (1889-1975) نے انسانی تاریخ کی 21 تہذیبوں کا مطالعہ کیا ہے اور اس کو اپنی کتاب مطالعہ تاریخ (A Study of History) کی بارہ جلدوں میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ٹوائن بی اس تاریخی مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ تمام بڑی بڑی تہذیبیں ان قوموں نے پیدا کیں جن کو خارجی دنیا کی طرف سے چیلنج پیش آیا۔ چیلنج نے ان کو متحرک کیا۔ اس نے ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارا۔ یہاں تک کہ مغلوب قومیں بالآخر غالب قومیں بن کر ابھر آئیں۔

اسلام کا یہ نظریہ انسان کے لیے بہت بڑی دین ہے۔ یہ نظریہ مایوس لوگوں کے لیے ہمت کا دروازہ کھولتا ہے۔ وہ شکایت کے مزاج کو ختم کر کے محنت کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر یہ سوچ ابھارتا ہے کہ وہ حالات کے خلاف فریاد واحتجاج میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ وہ حالات کا سامنا کر کے کامیابی اور فتح مندی کی منزل کی طرف رواں دواں ہو جائے۔

نفس امّارہ، نفس لوّامہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے جو کتاب لائے، اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر دو قسم کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ایک صلاحیت کو قرآن میں نفس امّارہ (یوسف، 12:53) کہا گیا ہے، اور دوسری صلاحیت کو نفس لوّامہ (القیامہ، 75:2)۔ نفس امّارہ سے وہی چیز مراد ہے جس کو انانیت (egoism) کہا جاتا ہے۔ اور

نفس لوّامہ سے مراد وہ چیز ہے جس کا نام نفسیاتی اصطلاح میں ضمیر (conscience) ہے۔

نفس امّارہ کی صفت سرکشی، ظلم اور فساد انگیزی ہے۔ اس کے برعکس، نفس لوّامہ کی صفت اعتراف، تواضع اور انصاف پسندی ہے۔ آدمی کے نفس امّارہ کا جاگنا ظلم کا جاگنا ہے، اور اس کے نفس لوّامہ کا جاگنا انصاف کا جاگنا ہے۔

یہ دونوں صلاحیتیں ہر آدمی کے اندر موجود ہیں۔ مگر ابتدائی حالت میں وہ سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب آپ کا کسی کے ساتھ معاملہ پیش آئے تو آپ کے لیے دو میں سے ایک کے انتخاب کا موقع ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو نفس امّارہ کو اپنا حصہ دار بنائیں، اور چاہیں تو نفس لوّامہ کو اپنے حصہ میں لیں جو گویا فریق ثانی کے اندر آپ کا ایک موافق وکیل ہے۔ اس معاملے کا انحصار اس پر ہے کہ فریق ثانی کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں میں سے کس صلاحیت کو آپ نے جگایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فریق ثانی کے اندر آپ کا ایک دشمن انسان چھپا ہوا ہے، اور اسی کے ساتھ آپ کا ایک دوست انسان بھی۔ اب یہ آپ کا امتحان ہے کہ آپ دونوں میں سے کس انسان کو جگاتے ہیں۔ آپ جس انسان کو جگائیں گے، وہی انسان آپ کے حصے میں آئے گا۔

سب سے زیادہ برا شخص وہ ہے جس کے لیے موقع تھا کہ وہ فریق ثانی کے اندر چھپے ہوئے اپنے موافق انسان کو جگاتا، مگر اس نے اپنی نادانی سے فریق ثانی کے اندر چھپے ہوئے اپنے دشمن انسان کو جگا دیا۔ یہی وہ بدبخت انسان ہے جس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ: إِنَّ الْفِتْنَةَ نَائِمَةٌ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ أَيْقَظَهَا۔ (التدوین فی اخبار قزوین للرافعی، جلد 1، صفحہ 291) یعنی، فتنہ سویا ہوا ہے، اس شخص پر خدا کی لعنت ہے جو اس کو جگائے۔

حدیث کی کتابوں میں ایک واقعہ آیا ہے۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے جو مسجد نبوی کے مقدس نام سے مشہور ہے۔ ایک اعرابی

(مشرک) وہاں آیا اور مسجد کے ایک حصے میں پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ کرام یہ دیکھ کر دوڑے کہ اس کو پکڑیں اور اس کی تنبیہ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کر دیا۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ تمہارا کام لوگوں کو آسانی دینا ہے۔ تمہارا کام لوگوں کو مشکل میں ڈالنا نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جس مقام پر اعرابی نے پیشاب کیا ہے، وہاں ایک بالٹی پانی بہا دو، وہ جگہ پاک ہو جائے گی۔ اعرابی کو آپ نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ یہ گھر خدا کی عبادت کے لیے ہے، یہ بول و براز کے لیے نہیں۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 285)

اگر آپ اس اعرابی کو پکڑتے اور مارتے تو اس کا نفس امّارہ جاگ اٹھتا۔ وہ مدینہ سے لوٹ کر جاتا تو آپ کے خلاف سازشیں کرتا اور ہر طرف لوگوں سے آپ کی برائی بیان کرتا۔ مگر جب آپ نے اس کے ساتھ مذکورہ قسم کا شریفانہ برتاؤ کیا تو اس کا نفس لوّامہ جاگ اٹھا۔ اب اس کو اپنے آپ پر شرم آنے لگی۔ اس کا دل بار بار اس سے کہنے لگا کہ میں کتنا برا ہوں اور محمدؐ میرے مقابلے میں کتنے اچھے ہیں۔

یہ اعرابی واپس ہو کر اپنے قبیلے میں گیا تو وہ اندر سے ایک بدلا ہوا انسان تھا۔ وہ اپنے قبیلے والوں سے کہتا پھرتا تھا کہ میں مدینہ گیا اور وہاں میں نے محمدؐ کے عبادت خانے کو گندہ کر دیا۔ مگر خدا کی قسم، محمدؐ نے نہ مجھ پر غصہ کیا، اور نہ محمدؐ نے مجھ کو جھڑکا: وَاللّٰهِ مَا قَهَرَنِي مُحَمَّدٌ، وَاللّٰهِ مَا زَجَرَنِي مُحَمَّدٌ۔ (مسند ابن أبي شيبة، حدیث نمبر 825)

اولاً مذکورہ اعرابی کا نفس لوّامہ جاگا تھا، مگر اس کی تقریروں سے قبیلے کے تمام افراد کی انسانیت جاگ اٹھی۔ چنانچہ اس اعرابی نے اور اس کے پورے قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ پیغمبر اسلام کی جماعت میں اضافہ کر کے آپ کی مزید طاقت کا ذریعہ بن گئے۔

اب اس واقعے کا موجودہ زمانے کی صورتِ حال سے تقابل کیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی غلطی پر ایک بالٹی پانی بہایا تھا اور اس کے بعد ایک پورا قبیلہ اس سے متاثر

ہو کر اسلام میں داخل ہو گیا۔ موجودہ زمانے میں لوگ اس قسم کی غلطیاں کرتے ہیں تو مسلمان ان سے لڑ پڑتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے اور ہزاروں بالٹی خون سڑکوں پر بہادیا جاتا ہے۔ مگر خون کی ان ہزاروں بالٹیوں نے مسلمانوں کے دشمنوں میں سے کسی ایک دشمن کو بھی اسلام کی رحمتوں کے سایے میں داخل نہیں کیا۔

دونوں کے درمیان اس غیر معمولی فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محبت کا پانی تھا، اور یہ نفرت کا خون ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی غلطیوں پر محبت کا پانی بہایا تھا، موجودہ مسلمان لوگوں کی غلطیوں پر نفرت کا خون بہا رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ محبت اور نفرت دونوں کا انجام یکساں نہیں ہو سکتا۔ محبت کے پانی کی ایک بالٹی بھی دلوں کو بدل دینے کے لیے کافی ہے۔ مگر نفرت کے خون کی لاکھوں بالٹیاں بھی انڈیل دی جائیں تو وہ لوگوں کے دلوں کو پھیرنے والی نہیں بنیں گی۔

مزید وضاحت کے لیے یہاں ایک اور واقعہ درج کیا جاتا ہے۔ 1968 میں ایک مسلمان تاجر نے یوپی کے ایک شہر میں اپنا گھر بنایا۔ اس کے قریب ایک ہندو ٹھیکیدار کا گھر تھا۔ دونوں گھروں کے درمیان ایک غیر ہموار خالی زمین تھی۔ مسلمان کا خیال تھا کہ یہ میری زمین ہے، انہوں نے چاہا کہ اس کو ہموار کریں اور اس کی گھیرا بندی کرکے اس کو اپنے مکان میں شامل کرلیں۔ ہندو ٹھیکیدار کو اس پر اعتراض ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ میری زمین ہے۔ آپ کا اس پر کوئی حق نہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہندو ٹھیکیدار نے شہر فرقہ پرست ہندوؤں کو اکسایا۔ یہاں تک کہ ایک روز ہندوؤں کا غصہ میں بھرا ہوا ایک ہجوم مسلمان کے گھر کے سامنے کی سڑک پر جمع ہو گیا۔ وہ اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا۔ مسلمان کے پاس بندوق موجود تھی، مگر اس نے بندوق استعمال نہیں کی۔ وہ خالی ہاتھ باہر نکلا، مجمع کا اندازہ کرنے کے بعد اس نے کہا کہ آپ میں

لیڈر کون ہے۔ ایک شخص (مسٹر سونڈ) آگے بڑھے۔ مسلمان نے مجمع سے کہا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریئے۔ اور سونڈ کو لے کر اندر اپنے دفتر میں گیا۔ وہاں ان کو بٹھا کر ان سے بات چیت شروع کی۔

مسلمان نے پوچھا کہ آپ حضرات نے کیوں زحمت فرمائی۔ مسٹر سونڈ نے نہایت روکھے انداز میں جواب دیا کہ آپ نے ہمارے بھائی کی زمین پر قبضہ کرلیا ہے، اس لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ مسلمان نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ دیکھیے زمین کاغذ پر ہوتی ہے۔ یعنی زمین کا فیصلہ کاغذی نقشہ اور دستاویزات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اب آپ ایسا کریں کہ زمین سے متعلق جو کاغذات میرے پاس ہیں وہ مجھ سے لے لیں، اور جو کاغذات ٹھیکیدار صاحب کے پاس ہیں، وہ ان سے لے لیں۔ اس کے بعد آپ نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے گھر چلے جائیں۔ دونوں کے کاغذات کو دیکھ کر آپ جو فیصلہ کردیں گے وہی مجھے منظور ہے۔

یہ سنتے ہی مسٹر سونڈ کا انداز بدل گیا۔ وہ ہنستے ہوئے باہر نکلے اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ آپ لوگ اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ میاں صاحب نے خود ہم کو اس معاملے میں جج بنا دیا ہے۔ ہم معاملے کی جانچ کرنے کے بعد اس کا فیصلہ کریں گے۔ مسٹر سونڈ اور ان کے ساتھیوں نے چند دن کاغذات کی جانچ کی۔ اس کے بعد انہوں نے مکمل طور پر مسلمان کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔

مذکورہ مسلمان اگر اپنی بندوق نکالتا اور ہندوؤں سے لڑائی کرتا تو وہ ان کی نفس امّارہ کو جگاتا۔ ایسی حالت میں فریق ثانی کا صرف ”دشمن انسان“ اس کے حصے میں آتا۔ مگر جب اس نے شرافت اور اخلاق والا انداز اختیار کیا تو اس نے فریق ثانی کے اندر چھپے ہوئے اپنے ”دوست انسان“ کو جگادیا۔ اس کے بعد وہی موافق انجام ہوسکتا تھا جس کا اوپر ذکر ہوا۔

برائی کے بدلے بھلائی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں انسانوں کو مسخر کرنے کی جو تدبیر بتائی گئی، وہ خلق عظیم (68:4) ہے۔ یعنی برابر کا اخلاق نہیں، بلکہ برتر اخلاق۔ یہ اخلاق کی وہ قسم ہے جب کہ آدمی ردّعمل سے اوپر اٹھ کر لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کا معاملہ کرتا ہے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ لوگ تمہارے ساتھ برا کریں تب بھی تم ان کے ساتھ اچھا کرو۔ تم برے سلوک کے جواب میں بھی اچھے سلوک پر قائم رہو۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیبہ والا ہے۔ (41:34-35)

اس آیت کی تشریح حضرت عبداللہ ابن عباس نے اس طرح کی ہے کہ اللہ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ غصہ کے وقت صبر کریں۔ وہ جہالت کے وقت بردباری اختیار کریں۔ وہ برائی کرنے والے کو معاف کر دیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان سے بچالے گا اور ان کے دشمن کو ان کے لیے زیر کر دے گا، گویا کہ وہ ان کا قریبی دوست ہے: أَمَرَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ بِالصَّبْرِ عِنْدَ الْغَضَبِ، وَالْحِلْمِ عِنْدَ الْجَهْلِ، وَالْعَفْوِ عِنْدَ الْإِسَاءَةِ، فَإِذَا فَعَلُوا ذٰلِكَ عَصَمَهُمُ اللّٰهُ مِنَ الشَّيْطَانِ، وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوُّهُمْ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد 7، صفحہ 181)

جس طرح آگ بجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اس کے اوپر پانی ڈالا جائے۔ آگ پر پٹرول ڈالنے سے آگ نہیں بجھتی۔ یہی معاملہ انسانی تعلقات کا ہے۔ انسانوں کے درمیان بھی برائی ختم کرنے کا اصول یہی ہے کہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ ختم کیا جائے۔ فطرت کے قانون کے مطابق برائی کبھی برائی کے ذریعہ ختم نہیں کی جا سکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی ربّانی اصول کا عملی نمونہ ہے۔ مثلاً رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مدینہ کے ایک یہودی سے کچھ قرض لیا۔ اس کے بعد یہودی ایک روز آپ کے پاس آیا اور برے انداز میں قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنے لگا۔ حتیٰ کہ اس نے یہ اشتعال انگیز جملہ بھی کہہ دیا کہ آلِ مُطّلب سب کے سب نادہند ہوتے ہیں۔

یہودی کی اس بدتمیزی پر صحابہ کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے اس کو مارنا چاہا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ آپ نے کہا کہ اس کو چھوڑ دو، کیوں کہ جس آدمی کا ہمارے اوپر بقایا ہو، اس کو کہنے سننے کا بھی حق ہے: دَعُوهُ فَإِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا۔ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 793؛ مسند احمد، حدیث نمبر 9390)

یہودی نے واضح طور پر بدسلوکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت اگر آپ ردّعمل کا انداز اختیار کرتے اور اس کی بدسلوکی کا جواب بدسلوکی سے دیتے تو اس کا غصہ اور بڑھ جاتا۔ اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا کہ قرض پر عناد کا اضافہ ہو جائے۔ مگر جب آپ نے اس کی بدسلوکی کا جواب اس طرح دیا کہ اس کے ساتھ اچھے سلوک کا مظاہرہ فرمایا تو وہ نہایت متاثر ہوا۔ اس کا دل آپ کے آگے جھک گیا۔ یہاں تک کہ اس نے اسلام قبول کرلیا۔ جو شخص اس سے پہلے اپنی دولت کے صرف ایک جزئی حصے کے بارے میں تاخیرِ ادائیگی پر راضی نہ تھا، اب اس کا یہ حال ہوا کہ اس نے اپنے آپ کو بھی اسلام کے حوالے کر دیا اور اپنے تمام اموال کو بھی۔

اس معاملے کی مزید وضاحت کے لیے یہاں آپ کا ایک اور واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔ مکہ کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا تھا۔ انہوں نے کسی سبب کے بغیر آپ کو ہر قسم کی اذیتیں پہنچائی تھیں۔ یہاں تک کہ آپ کو اپنا وطن مکہ چھوڑ کر مدینہ چلا جانا پڑا۔ وہ لوگ اس کے بعد بھی خاموش نہیں ہوئے۔ انہوں نے آپ کے خلاف خونی جنگیں چھیڑ دیں، جن کی تفصیل سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔

اس کے بعد وہ وقت آیا جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی اور مکہ فتح ہو گیا۔ اس وقت مکہ کے لوگ بیت اللہ میں آپ کے پاس لائے گئے۔ یہ لوگ ظالم بھی تھے اور جنگی مجرم بھی۔ عام رواج کے مطابق ان کا انجام یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ لوگ اسی انجام کے اندیشے کے تحت آپ کے سامنے اپنی گردن جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔

مگر آپ نے ان ظالموں اور جنگی مجرموں کو کسی بھی قسم کی کوئی سزا نہ دی۔ حتیٰ کہ ان سے ملامت کا کوئی کلمہ بھی نہیں کہا۔ آپ نے سب کو بلا شرط یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو: اذْهَبُوا فَأَنْتُمْ الطُّلَقَاءُ۔ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 412)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان دشمنوں کے ساتھ اسی طرح برا سلوک کرتے جو انہوں نے آپ کے ساتھ کیا تھا تو وہ بدستور دشمن کے دشمن بنے رہتے۔ اگر آپ انہیں قتل کر دیتے تب بھی ان کی اولادوں میں انتقام کا جذبہ بھڑکتا۔ مکہ کی بستی کبھی بھی منفی جذبات اور تخریبی کارروائیوں سے خالی نہ ہو سکتی۔ مگر جب آپ نے ان سب کو کسی شرط یا کسی ملامت کے بغیر معاف کر دیا تو گویا آپ نے مکہ میں تاریخ کا نیا ورق کھول دیا۔

اہل مکہ کو اس طرح آزاد کر دینا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ انہیں دوبارہ نئی زندگی دینے کے ہم معنی تھے۔ یہ ان کے ساتھ اتنا بڑا احسان تھا کہ اس کے بعد وہ سرکشی اور دشمنی کا تحمل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد وہ خود اپنی اندرونی نفسیات کے تحت مجبور ہو گئے کہ آپ کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیں۔ چنانچہ راوی کہتے ہیں کہ وہ وہاں سے اس طرح نکلے گویا کہ وہ قبروں سے نکلے ہوں، اور وہ اسلام میں داخل ہو گئے: فَخَرَجُوا كَأَنَّمَا نُشِرُوا مِنَ الْقُبُورِ فَدَخَلُوا فِي الْإِسْلَامِ۔ (السنن الکبری للبیہقی، حدیث نمبر 18275)

برائی کے جواب میں برائی مسئلہ کو بڑھانے والی ہے۔ اس سے نفرت اور دشمنی میں

اضافہ ہوتا ہے۔مگر برائی کے جواب میں بھلائی کی جائے تو اس سے نفرت اور دشمنی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ایسی روش اپنے اندر بے پناہ تسخیری طاقت رکھتی ہے۔ اور پیغمبر اسلام نے اسی تسخیری طاقت سے اپنے دشمنوں کو فتح فرمایا۔

تعمیر واستحکام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ''سپریم سکسیس'' کا ایک اہم راز یہ تھا کہ آپ 'اقدام' سے زیادہ 'استحکام' کو اہمیت دیتے تھے۔ داخلی تعمیر اور اندرونی استحکام کی آپ کے نزدیک اتنی زیادہ اہمیت تھی کہ اس کے لیے آپ ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر سکتے تھے۔تعمیر و استحکام کے مقصد کو آپ ہر حال میں حاصل کرنا چاہتے تھے،خواہ اس کی جو بھی قیمت آپ کو دینی پڑے۔

اس کی ایک مثال بدر کے قیدیوں کا معاملہ ہے۔قدیم عرب میں صرف مکہ ایک ایسا شہر تھا جہاں ایسے لوگ تھے جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔مدینہ اور دوسری بستیوں میں عام طور پر لوگ لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے۔ بدر کی جنگ کے بعد اہل مکہ کے ستر آدمی گرفتار ہو کر مدینہ آئے۔ان میں اکثر لوگ ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔عام رواج کے خلاف آپ نے ان کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ ان کی رہائی کا یہ آسان فدیہ مقرر فرمایا کہ ان کا ایک شخص مدینہ کے مسلم نوجوانوں میں سے کم از کم دس آدمیوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے: فَجَعَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فِدَاءَهُمْ أَنْ يُعَلِّمُوا أَوْلَادَ الْأَنْصَارِ الْكِتَابَةَ۔(مسند احمد، حدیث نمبر 2216)

یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا اسکول تھا جو مدینہ میں قائم کیا گیا۔ اس اسکول کے تمام استاد مشرک بلکہ اسلام دشمن تھے۔پیغمبر اسلام کی بلند نظری کی یہ کیسی عجیب مثال ہے۔ یہ تعلیم کی اہمیت کا ایک انتہائی انقلابی نمونہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں قائم فرمایا۔اس نوعیت کی کوئی دوسری مثال غالباً پوری انسانی تاریخ میں موجود نہیں۔

تعلیمی انتظام کا یہ معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ اس میں بہت بڑا خطرہ (risk) شامل تھا۔ کیوں کہ یہ ''اساتذہ'' سب کے سب وہ لوگ تھے جن کی اسلام دشمنی مسلّم ہو چکی تھی۔ اس بات کا یقینی خطرہ تھا کہ یہ لوگ رِہا ہونے کے بعد جنگی تیاری کریں گے۔ اور دوبارہ مدینہ پر حملہ آور ہوں گے۔ چنانچہ عملاً بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ لوگ مدینہ سے رِہا ہو کر مکہ پہنچے تو انہوں نے اپنے بدر کے مقتولین کے نام پر جذباتی تقریریں کیں۔ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں کو بدلہ لینے پر ابھارا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ بدر کی لڑائی کے صرف ایک سال بعد احد کی لڑائی پیش آئی۔ اس یقینی خطرے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے قیدیوں کو مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے استعمال فرمایا۔

اس طرح آپ نے یہ مثال قائم فرمائی کہ علم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کو ہر حال میں حاصل کرنا چاہیے، خواہ اس کے حصول کے لیے کتنا ہی بڑا خطرہ مول لینا پڑے۔ علم وہ طاقت ہے جو بالآخر آدمی کو ہر چیز دے دیتا ہے، حتیٰ کہ وہ چیز بھی اس کو مزید اضافے کے ساتھ مل جاتی ہے جس کو ابتداءً علم کو حاصل کرنے کی راہ میں اسے کھونا پڑا تھا۔

اس سلسلے کی دوسری مثال وہ ہے جو صلح حدیبیہ کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ کے لیے عمرہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش نے آپ کو روک دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ آپ عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مزید اصرار کے بغیر وہیں رک گئے۔

اس کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان معاہدے کی بات شروع ہوئی۔ اس گفتگو میں اہل مکہ نے بے حد سرکشی دکھائی۔ انہوں نے معاہدہ کے لیے ایسی شرطیں پیش کیں جو یک طرفہ طور پر ان کے حق میں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ان نازیبا شرطوں کو

مان لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل مکہ کی یک طرفہ شرطوں کو مان لینے کے بعد آپ کو ایک وقفہ تعمیر حاصل ہو رہا تھا۔ اہل مکہ معاہدہ کے تحت اس کے پابند ہو گئے تھے کہ وہ آئندہ دس سال تک مسلمانوں کے خلاف جنگ نہ چھیڑیں گے۔ اس طرح یہ معاہدہ آپ کو موقع دے رہا تھا کہ آپ جنگ اور ٹکراؤ کے مسائل سے فارغ ہو کر یکسوئی کے ساتھ داخلی استحکام کا کام کر سکیں۔

اس وقفہ امن سے فائدہ اٹھا کر آپ نے اپنی دعوتی سرگرمیاں بڑھا دیں۔ اسلام تیزی سے قبائل کے درمیان پھیلنے لگا۔ اسلام کی عددی طاقت میں نمایاں طور پر اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ یہ حال ہوا کہ حدیبیہ کے سفر میں آپ کے ساتھ صرف چودہ سو اصحاب شریک تھے۔ اس کے بعد دو سال کے اندر جب آپ نے دوبارہ مکہ کی طرف مارچ کیا تو آپ کے ساتھیوں کی تعداد دس ہزار ہو چکی تھی۔ یہ تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مکہ کے لوگ محض اس کی خبر سے دہشت زدہ ہو گئے اور کسی مقابلے کے بغیر مکہ کو آپ کے حوالے کر دیا جو اس وقت گویا عرب کی راجدھانی تھا۔

تعمیر و استحکام کے معاملے کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کی حکمت یہ ہے کہ قوموں اور ملتوں کی زندگی میں یہی وہ چیز ہے جو سب سے زیادہ فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ کسی فرد یا قوم کو خارجی مقام عین اسی تناسب کے بقدر ملتا ہے جو اس نے داخلی تعمیر کے اعتبار سے اپنے لیے بنایا ہے، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

اس دنیا میں کسی قوم کو جو مقام ملتا ہے وہ اس اعتبار سے ملتا ہے کہ وہ داخلی تعمیر اور اندرونی استحکام کے اعتبار سے کس درجہ پر ہے، نہ یہ کہ لفظی ہنگامہ آرائیوں کے اعتبار سے اس نے کتنا طوفان برپا کیا ہے۔ تعمیر و استحکام کے حصول کا معیار قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اتنا زیادہ ہو کہ استعمال کے بغیر صرف اس کی موجودگی فریق ثانی کو مرعوب اور خوفزدہ کر

دینے کے لیے کافی ہو جائے: تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ۔(8:60)

حدیث میں بھی یہ بات مختلف لفظوں میں آئی ہے۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ایک مہینہ کی مسافت تک پہنچنے والے رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی ہے: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 427)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو ایسی تدبیر کار کی تعلیم دی گئی ہے کہ جب میں اس کے مطابق اپنے آپ کو تیار کروں تو میری ہیبت دور دور کے مقام تک پہنچ جائے۔

خلاصہ کلام

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو صراط مستقیم دکھائی۔ آپ اس پر معیارِ کمال کی حد تک قائم تھے۔ آپ ایمان باللہ کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر تھے اور اپنے اصحاب کے اندر بھی آپ نے ایمان کی حرارت پوری طرح بھر دی تھی۔ آپ ہمیشہ فطرت کے نقشے پر عمل کرتے تھے۔ اور فطرت کی مساعدت سے ہمیشہ کامیابی کی منزل پر پہنچے تھے۔

آپ نے زندگی کو اس نظر سے دیکھا کہ اس کے عُسر کو یُسر میں تبدیل کریں اور اپنے اصحاب میں بھی آپ نے یہی نظر پیدا فرمائی۔ آپ نے انسانوں کے ساتھ اس برتر اخلاق کا ثبوت دیا جو ان کی فطرتِ ربّانی کو جگائے، حتیٰ کہ دشمن بھی آپ کے دوست بن جائیں۔ آپ نے ہمیشہ برائی کے جواب میں بھلائی کا سلوک کیا، نفرت کرنے والوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ فرمایا۔ آپ نے دوسروں کی تخریب سے زیادہ اس پر توجہ دی کہ اپنے آپ کو مستحکم کریں اور اس طرح اپنے آپ کو دوسروں کے لیے ناقابلِ تسخیر بنا دیں۔ یہ صفتیں وہ ہیں جو تمام فوجوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ وہ فتح و کامیابی کو آخری حد تک یقینی بنا دینے والی ہیں۔

مختصر طور پر، یہ تھا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ کامیابی (supreme success) کا راز، یہی تھی وہ خدائی صراط مستقیم جس کی کامل پیروی نے آپ کو ساری انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ کامیاب (supremely successful) انسان بنا دیا۔ یہ نمونہ ساری انسانی نسلوں کے لیے روشنی کا مینار ہے۔ جو لوگ بھی پیغمبر خدا کو اپنا سچا رہنما بنائیں اور اس کے نمونہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں وہ دوبارہ اسی اعلیٰ کامیابی تک پہنچیں گے جہاں رسولؐ اور اصحاب رسول اس ربانی طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے پہنچے۔

صبر ایک ابدی حکم

ایک فلسطینی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے دین میں صبر کی اہمیت کا ذکر کیا اور صبر سے متعلق قرآن کی آیتیں ان کے سامنے پیش کیں۔ انہوں نے فوراً کہا: صبر کی آیتیں تو مکی دور میں اُتری تھیں۔ ہجرت کے بعد صبر کا حکم منسوخ کر دیا گیا اور جہاد وقتال کی آیتیں اتاری گئیں۔ اب ہم دور صبر میں نہیں ہیں۔ اب ہم دور جہاد میں ہیں۔ اب ہمارے تمام معاملات جہاد کے ذریعے درست ہوں گے اور یہی کام ہمیں کرنا ہے۔

یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے جس میں بے شمار لوگ مبتلا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک ابدی حکم ہے۔ اس کا تعلق ہر دور اور ہر زمانے سے ہے۔ صبر تمام دینی اعمال کا خلاصہ ہے۔ آدمی کوئی دینی عمل صحیح طور پر اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ اس کے اندر صبر کا مادہ ہو۔ جس آدمی سے صبر رخصت ہو جائے، وہ کوئی بھی دینی کام صحیح ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتا، خواہ وہ کلمہ توحید پر استقامت کا معاملہ ہو یا میدان مقابلہ میں شجاعت کا معاملہ۔ یا اور کوئی معاملہ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے، اور علی الاطلاق طور پر اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں صبر کا مادہ ایک سو سے زیادہ بار استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ ایک مدنی سورہ ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ تم لوگ صبر اور نماز سے مدد لو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ (2:153)

حدیث میں صبر کی بہت زیادہ فضیلت آئی ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ بخاری ومسلم کی ایک متفق علیہ روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علی وسلم

نے فرمایا کہ اللہ نے صبر سے زیادہ اچھا اور بڑا عطیہ کسی شخص کو نہیں دیا: وَلَنْ تُعْطَوْا عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر 6105) ایک اور حدیث میں ہے کہ صبر مومن کا بھروسہ ہے: الصَّبْرُ مِعْوَلُ الْمُسْلِمِ۔ (جامع الاصول، حدیث نمبر 4640)

صبر کے لغوی معنیٰ رکنے کے ہیں۔ امام راغب نے صبر کی حقیقت ان لفظوں میں بیان کی ہے: الصَّبْرُ حَبْسُ النَّفْسِ عَلَى مَا يَقْتَضِيهِ الْعَقْلُ (المفردات للراغب الاصفہانی، صفحہ 474)۔ یعنی، صبر اس چیز سے نفس کو روکنے کا نام ہے جس کا عقل تقاضا کرے۔ عربی میں کہا جاتا ہے: صَبَرْتُ نَفْسِي عَلَى ذَلِكَ الْأَمْرِ، أَيْ حَبَسْتُهَا (مقاییس اللغۃ، جلد 3، صفحہ 329)۔ یعنی، میں نے اپنے نفس کو فلاں چیز سے روک دیا۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں موافق پہلوؤں کے ساتھ ناموافق پہلو بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کسی کام کو کامیابی کے ساتھ انجام دینے کے لیے صبر لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہاں اپنی خواہش کو دبا کر اپنی عقل کو رہنما بنانا پڑتا ہے۔ یہاں ایک چیز کو لینے کے لیے دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں آج پر توجہ دینے کے لیے کل کو مستقبل کے خانے میں ڈالنا پڑتا ہے۔ یہاں خلافِ مزاج باتوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں ردّعمل کی نفسیات سے آزاد رہ کر مثبت سوچ کے تحت اپنا منصوبہ بنانا پڑتا ہے۔ ان تمام چیزوں کا تعلق صبر سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں صبر کے بغیر کبھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔

دنیوی کاموں کی طرح دینی کام کے لیے بھی صبر لازمی طور پر ضروری ہے۔ جس زمین پر اور جس انسانی ماحول میں ایک دنیا دار کام کرتا ہے اسی زمین پر اور اسی انسانی ماحول میں دیندار بھی اپنا عمل کرتا ہے۔ اس لیے یہاں دینی مقصد کو پانے کے لیے بھی صبر کا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ صبر کے بغیر کوئی بھی دینی کام نتیجہ خیز طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

اسلام کی تاریخ وسیع تقسیم کے مطابق، تین قسم کے حالات سے گزری ہے— دعوت، خلافت، ملوکیت۔ دعوتی دور کی معیاری مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا 23 سالہ زمانہ ہے۔

یہی وہ زمانہ ہے جس کے مطالعے سے دعوت کے آداب اور اس کے طریقے صحیح طور پر معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے بعد خلافت کا زمانہ آتا ہے جو گویا صحیح معنی میں نائبین رسول کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ سے شروع ہوتا ہے اور حضرت علی ابن ابی طالب پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد مؤرخین اسلام کے مطابق ملوکیت کا دور ہے۔ یہ زمانہ حضرت امیر معاویہ سے شروع ہوا اور آج تک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔

ان تینوں دَوروں میں جو اسلامی کردار مطلوب ہے، اس پر قائم ہونے کے لیے یکساں طور پر صبر کی اہمیت ہے۔ یہاں ہم تینوں دَوروں کے بارے میں کلام کریں گے۔ پہلے دونوں دَوروں کے بارے میں مختصر طور پر اور تیسرے دور کے بارے میں زیادہ مفصل طور پر۔

دعوت کا دور

محمد بن اسحٰق بیان کرتے ہیں کہ بیعت عقبہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور خون بہانا آپ کے لیے حلال نہیں کیا گیا تھا۔ آپ کو حکم تھا کہ آپ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ اور تکلیفوں پر صبر کریں۔ اور جاہلوں سے روگردانی کریں۔ قریش کا یہ حال تھا کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ آپ کی پیروی کرتے وہ ان پر ظلم کرتے۔ ان کے دین کے بارے میں انہیں سخت آزمائش میں مبتلا کرتے۔ قریش نے ان کو ان کی بستیوں سے نکال دیا۔ چنانچہ آپ کے پیروؤں میں سے کچھ لوگ سخت آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ اور کچھ لوگ قریش کے ہاتھ سے تکلیفوں کا شکار رہوئے۔ اور کچھ لوگ ان سے بچنے کے لیے دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ ایک جماعت حبش چلی گئی۔ کچھ لوگوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی یا اور کسی طرف چلے گئے۔ جب قریش نے اس طرح اللہ کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی اور اللہ نے ان کے لیے جس عزت کا ارادہ کیا تھا اس کو رد کر دیا، اور اپنے نبی کو جھٹلایا۔ اور ان لوگوں کو تکلیف دی اور جلاوطن کیا جنہوں نے اللہ کی عبادت کی اور اس کو

ایک مانا اوراس کے دین کو مضبوطی سے پکڑ لیا، اس وقت اللہ نے اپنے رسول کو جنگ کی اجازت دی اور ان لوگوں کے لیے حفاظت اور مدد کا وعدہ کیا جن پر ظلم اور زیادتی ہورہی تھی۔ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اس اجازت کے بارے میں سب سے پہلے سورۃ الحج (آیت 41-39 اُتاری گئی۔ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 75)

مکہ کا دور، دعوت کا دور تھا۔ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو حکم تھا کہ اپنی ساری توجہ صرف دعوت پر مرتکز رکھیں۔ غیر مسلموں کی طرف سے خواہ کتنی ہی دل آزاریاں کی جائیں اور کتنی ہی تکلیفیں پہنچائی جائیں ان پر کوئی ردّعمل ظاہر نہ کریں۔ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ یک طرفہ طور پر صبر و برداشت پر قائم رہتے ہوئے دعوت کا مثبت کام جاری رکھیں۔

دعوت کا کام اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک داعی کے دل میں مدعو کی خیر خواہی نہ ہو۔ یہ خیر خواہی اتنی زیادہ ہونی چاہیے کہ مدعو کی زیادتیوں کے باوجود اس کے حق میں داعی کے دل سے ہدایت کی دعائیں نکلتی رہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑایا اور آپ پر پتھر مارے۔ ان کے بارے میں آپ نے یہ دعا فرمائی کہ خدایا، میری قوم کو ہدایت دے، وہ نہیں جانتے: رَبِّ اهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لا يَعْلَمُونَ۔ (تفسیر ابن ابی حاتم، جلد 10، صفحہ 3192)

خلافت کا دور

خلافت کا دور اقتدار کا دور ہے۔ اقتدار، عین اپنی طبیعت کے اعتبار سے بہت سی خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ اس لیے دور خلافت (دور اقتدار) میں صبر کی اہمیت ہمیشہ سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

1۔ دور خلافت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر عہدوں کی طلب بڑھ

جاتی ہے۔ ہر آدمی یہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کو ایک اچھا سیاسی عہدہ مل جائے۔ اگر یہ مزاج باقی رہے تو خلافت کا پورا نظام برباد ہو کر رہ جائے گا۔

یہاں صبر (اپنی خواہشات کو روکنا) اس بات کی ضمانت ہے کہ خلافت کے دور میں عہدوں کی طلب کی برائی نہ پیدا ہو۔ عہدے اگر اہلیت کی بنیاد پر دیے جائیں تو اس سے خلافت کا نظام طاقت ور ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عہدے اگر خواہشات کی بنیاد پر دیے جانے لگیں تو خلافت کا پورا نظام کمزور ہو کر رہ جائے گا۔ ایسی حالت میں خلافت کے نظام کو صحت مند حالت پر باقی رکھنے کے لیے صبر کی صفت انتہائی طور پر ضروری ہے۔

دور اول میں اس کی ایک عظیم الشان مثال انصار کا اس پر راضی ہونا ہے کہ وہ عہدہ خلافت کے معاملے میں قریش سے نزاع نہیں کریں گے۔ انصار نے اسلامی انقلاب لانے کے لیے یکساں طور پر قربانیاں دی تھیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کس شخص کو خلیفہ بنایا جائے تو حضرت ابوبکر صدیق نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ خلیفہ قریش میں سے ہو۔ اگر قریش کے باہر کسی کو خلیفہ بنایا جائے تو، تاریخی روایت کی بنا پر، اہل عرب کے لیے وہ قابل قبول نہ ہوگا اور لوگ اس کی اطاعت سے انکار کر دیں گے۔ انصار نے اس مصلحت کی اہمیت کو محسوس کیا اور خلافت کے مطالبہ سے دست بردار ہو گئے۔

انصار کا یہ فعل بلاشبہ اسلامی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ اگر وہ اپنی قربانیوں کی فہرست بتا کر عہدۂ خلافت کے لیے اصرار کرتے تو یقینی تھا کہ مسلمان اقتدار کی رسّہ کشی میں مشغول ہو جاتے اور اسلام کی تاریخ بننے سے پہلے مدینہ میں دفن ہو جاتی — یہ واقعہ بلاشبہ صبر کا واقعہ ہے۔ انصار کے اندر اگر صبر کا مادّہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز یہ عظیم الشان کارنامہ انجام نہیں دے سکتے تھے۔

2۔ حکومت ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق پورے ملک سے ہوتا ہے۔ ملک میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی، جاہل بھی اور عالم بھی، نرم بھی اور سخت بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خلیفہ (حکمراں) کو لوگوں کی طرف سے تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خلیفہ اگر لوگوں کی تنقیدوں کو برداشت نہ کرے اور اس کو ذاتی انتقام کا مسئلہ بنا لے تو وہ کبھی انصاف نہیں کرسکتا۔ خلیفہ کو عدل پر قائم رکھنے کے لیے لازمی طور پر یہ صفت درکار ہے کہ وہ لوگوں کی تنقیدوں کو برا نہ مانے۔ لوگوں کی سخت کلامی کے باوجود وہ ان کے ساتھ نرمی اور اعتدال کا رویہ اختیار کرے۔

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر کے ایک سرکاری فرمان کو ایک بار حضرت عمر نے برسرعام پھاڑ کر پھینک دیا مگر خلیفہ اوّل نے اس کو برا نہیں مانا اور نہ اس بنا پر ان کے دل میں عمر فاروق کی اہمیت کم ہوئی۔ (تاریخ دمشق، جلد 9، صفحہ 196-195) حضرت عمر فاروق جب خلیفہ ہوئے تو بار بار ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان پر سخت الفاظ میں تنقیدیں کیں۔ مگر حضرت عمر نے کبھی ان کے خلاف منفی ردّعمل ظاہر نہیں کیا۔ مثلاً ایک بار تقریر کے دوران برسرِ عام ایک شخص نے کہا کہ اگر ہم تمہارے اندر ٹیڑھ دیکھیں گے تو ہم اپنی تلوار سے تمہیں سیدھا کر دیں گے۔ خلیفہ ثانی اس پر غصہ نہیں ہوئے بلکہ یہ کہا کہ اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ایک ایسی قوم میں بنایا کہ اگر میرے اندر انحراف پیدا ہو تو وہ اپنی تلواروں سے مجھے سیدھا کر دے۔ (الزھد والرقائق لابن المبارک، اثر نمبر 512)

خلیفہ کے اندر تنقید کو برداشت کرنے کا یہ مادہ انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ ملک اور قوم کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ مگر یہ اعلیٰ صفت کسی شخص کے اندر اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ اس میں صبر کا مادہ موجود ہو۔ صبر کسی خلیفہ کو عدل پر قائم رکھتا ہے، اگر اس کے اندر صبر نہ ہو تو کوئی بھی چیز اس کو ظلم کی راہ پر جانے سے روک نہیں سکتی۔

ملوکیت کا دور

اسی طرح ملوکیت کے دور میں بھی صبر انتہائی طور پر ضروری ہے۔ زندگی میں اتار چڑھاؤ کا آنا لازمی ہے، اسی طرح ملوکیت کا زمانہ بھی ضرور آ کر رہتا ہے۔ ایسے وقت میں اگر ملوکیت کے نظام پر صبر نہ کیا جائے تو مسلم معاشرہ میں زبردست خلفشار برپا ہوگا۔ امت دو طبقوں میں بٹ جائے گی۔ ایک، ملوک اور ان کے ساتھی۔ دوسرے عوام اور ان کے رہنما دونوں ایک دوسرے کے خلاف مسلح اور غیر مسلح لڑائی شروع کر دیں گے، جس کا انجام دوطرفہ بربادی کے سوا اور کسی شکل میں نہیں نکلے گا۔

ایسے حالات میں صبر یہ کارنامہ انجام دیتا ہے کہ لوگ حکمرانوں سے اعراض کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے دوسرے تعمیری اور اصلاحی میدانوں میں اپنے آپ کو مصروف کر لیں۔ اس طرح نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی طاقت ضائع ہونے سے بچ کر اپنا مفید استعمال پا لیتی ہے، بلکہ اگر یہ غیر سیاسی اصلاحی کوششیں زیادہ بڑے پیمانہ پر صالح معاشرہ کی تشکیل کر سکیں تو بالواسطہ طور پر حکومت کا ادارہ بھی ضرور متاثر ہوتا ہے۔ وہ سیاسی مقصد جو براہ راست عمل کے ذریعہ حاصل نہیں ہوا تھا، وہ بالواسطہ عمل کے ذریعے حاصل کر لیا جاتا ہے۔

صبر، خواہ وہ دعوت کے مرحلے میں ہو یا خلافت اور ملوکیت کے مرحلے میں ہمیشہ ناگزیر طور پر ضروری ہوتا ہے۔ ہر قسم کی ترقی اور کامیابی صبر کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ صبر اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی ناممکن کے پیچھے نہیں دوڑے گا، بلکہ ممکن کے دائرے میں اپنی کوششیں صرف کرے گا۔ صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ الاقدم فالاقدم کے اصول پر عمل کرے، وہ منصوبہ بند انداز میں اپنا تمام کام کرنے لگے۔

دور ملوکیت میں صبر کی اہمیت کی تفصیل "راہ عمل" کے متعلقہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں اس کی مزید تفصیلات درج ہیں۔

دعوت کی اہمیت

اسلام کی ابتدائی ہزار سالہ تاریخ غلبہ اور فتوحات کی تاریخ تھی۔ مگر اس کے بعد کی موجودہ تاریخ حیرت انگیز طور پر شکستوں اور ہزیمتوں کی تاریخ بن گئی ہے۔ موجودہ زمانے میں شہرت اور مقبولیت کے اعتبار سے مسلمانوں نے بہت بڑی بڑی شخصیتیں پیدا کیں، مذہبی بھی اور سیکولر بھی، بے ریش بھی اور باریش بھی، ان لوگوں نے بہت سی عظیم تحریکیں اٹھائیں اور بے شمار قربانیاں دیں، مگر نتیجہ مکمل طور پر صفر ہے، مسلمانوں کی مغلوبیت میں ایک فیصد بھی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

یہ ایسا واضح واقعہ ہے جو ہر شخص کو معلوم ہے، خواہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ۔ تاہم معاملے کی وضاحت کے لیے یہاں ہم چند مثالیں نقل کریں گے۔

قربانیاں بے نتیجہ رہیں

1۔ سید احمد بریلوی (1786-1831) اور ان کے ہزاروں ساتھیوں نے پنجاب کی سکھ اسٹیٹ (مہاراجہ رنجیت سنگھ) کے خلاف مسلح اقدام کیا۔ مگر ان کا اقدام مکمل طور پر ناکام رہا۔ سید احمد بریلوی اور ان کے ساتھی 1831 میں بالا کوٹ کے میدان میں بری طرح ہلاک کر دیے گئے۔ سکھ ریاست اپنی پوری شان کے ساتھ بدستور قائم رہی۔

اس کے بعد اسی سکھ ریاست سے انگریزوں کا ٹکراؤ ہوا۔ اس ٹکراؤ میں انگریز مکمل طور پر کامیاب رہے۔ 1846 میں انگریزوں کی کامیابی اس نوبت کو پہنچ گئی کہ سکھوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ ایک انگریز ریزیڈنٹ لاہور میں رہے۔ 1849 میں انگریز سکھ ریاست کو آخری طور پر ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سکھوں کے اوپر انگریزوں نے اتنا زیادہ قابو پایا کہ

ہندستان میں انگریز فوج کا20 فیصد سے زیادہ حصہ سکھوں کا ہوتا تھا۔ 1857 کے "غدر" کو جس انگریزی طاقت نے ناکام بنایا اس میں سکھ بڑی تعداد میں شامل تھے۔ (16-745)

2۔ انیسویں صدی میں انگریز ایشیا کے بڑے حصے پر قابض ہوگئے۔ اس وقت سید جمال الدین افغانی (1838-1879) اور ان کے بہت سے ہم خیال مسلم رہنما انگریزوں کے خلاف اٹھے۔ ہندستانی علماء نے 1857 میں اور اس کے بعد انگریزوں کے خلاف لڑائیاں کیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی انگریزی اقتدار کو ختم نہ کرسکا۔ مسلم رہنماؤں کی ہر کوشش خود ان کی اپنی شکست اور ہلاکت پر ختم ہوتی رہی۔

اس کے بعد ہندستان کے "ہندولیڈر" مہاتما گاندھی (1869-1948) سامنے آئے۔ انہوں نے 1919 میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک شروع کی۔ 1942 میں انہوں نے انگریزو ہندستان چھوڑو (Quit India) کا نعرہ دیا۔ مہاتما گاندھی اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب رہے۔ انگریز 1947 میں ہندستان چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ ہندستان میں انگریزی اقتدار ختم ہونے ہی کا یہ نتیجہ بھی تھا کہ اس کے بعد انہیں مسلم دنیا اور عرب ممالک سے اپنی فوجیں واپس بلانی پڑیں۔ عرب دنیا کا انگریزی اقتدار سے آزاد ہونا براہ راست طور پر ہندستان کی آزادی کا نتیجہ تھا جو مہاتما گاندھی کی قیادت کے تحت ظہور میں آیا۔

3۔ فلسطین میں 1948 میں یہودی ریاست (اسرائیل) قائم ہوئی۔ اسی وقت سے عربوں اور ساری دنیا کے مسلمانوں نے اس کے خلاف جدوجہد شروع کردی۔ شیخ حسن البنا (1906-1948) سے لے کر مسٹر یاسر عرفات (1929-2004) تک بے شمار مسلم رہنماؤں کے نام اس جدوجہد کی فہرست میں شامل ہیں۔ ساری دنیا کے تمام مسلمان بلااختلاف اس مہم کی حمایت کررہے ہیں۔ اس مسلح مہم میں لاکھوں لوگ اپنی جانیں

دے چکے ہیں۔ لاتعداد بلین ڈالر اس پر، براہ راست یا بالواسطہ طور پر خرچ کیے جا چکے ہیں۔ مگر نتیجہ بالکل برعکس ہے۔

افغانستان سے مراکش تک پھیلی ہوئی وسیع وعریض مسلم دنیا کے اندر اسرائیل ایک چھوٹا سا دھبّہ ہے۔ مگر اس کے خلاف مسلمانوں کی نصف صدی کی کوششیں بھی بالکل ناکام ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ 1967 کی جنگ کے بعد اسرائیل کا رقبہ، ابتدائی رقبہ کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ ہو گیا۔ اسرائیل کے مقابلے میں ساری دنیا کے مسلمان مکمل طور پر بے بس ثابت ہو رہے ہیں۔

اس ناکامی کی توجیہ مسلم رہنماؤں کی طرف سے یہ کی جاتی ہے کہ اسرائیل میں ہمارا مقابلہ دراصل یہودیوں سے نہیں ہے بلکہ ایک سپر پاور (امریکہ) سے ہے۔ مقابلہ اگر صرف یہودیوں سے ہوتا تو اب تک ہم اس کا خاتمہ کر چکے ہوتے۔ امریکہ کی حمایت کی وجہ سے اب تک ہم اس محاذ پر کامیاب نہ ہو سکے۔

مگر اسی سپر پاور (امریکہ) کے بارے میں دوسری مثال لیجیے۔ یہ مثال ویٹ نام کی ہے۔ 1954 کے جنیوا معاہدہ کے تحت ویٹ نام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ نارتھ ویٹ نام پر کمیونسٹوں کا غلبہ تھا، اور ساؤتھ ویٹ نام پر امریکہ کا۔ تاہم کچھ لوگوں نے اس تقسیم کو نہیں مانا۔ ساؤتھ ویٹ نام میں کمیونسٹ نواز باغیوں نے اپنی مخالفانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اس کو فرو کرنے کے لیے امریکہ کی مسلح فوجیں 1965 میں ویٹ نام میں داخل ہو گئیں اور 1975 تک اپنی ساری قوت کے ذریعہ ''باغیوں'' کی طاقت کو کچلنے کی کوشش کرتی رہیں۔ لیکن گیارہ سال کی کوشش مکمل طور پر ناکام رہی۔ آخر کار 1975 میں امریکہ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ یک طرفہ فیصلہ کے تحت اپنی فوجوں کو ویٹ نام سے واپس بلا لے۔

فلسطین (اسرائیل) میں امریکہ صرف بالواسطہ طور پر شریک ہے۔ اس کے باوجود

تمام عرب اور مسلمان اس کے مقابلے میں بے بس ثابت ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف ویٹ نام میں امریکہ اپنی پوری فوجی طاقت کے ساتھ براہ راست دخیل تھا، پھر بھی ویٹ نامیوں نے امریکہ کو ناکام واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔

فرض منصبی سے غفلت

مسلمانوں کا اور مسلم تحریکوں کا یہ انجام کیوں ہو رہا ہے، مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے اس کو اغیار کے خانے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ دراصل مسلم دشمن طاقتوں کی سازش اور عناد ہے جس نے ہم کو موجودہ ناکامی سے دو چار کر رکھا ہے۔ مگر یہ بات قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ یہ قرآن کے اوپر عدم اعتماد کے ہم معنی ہے۔

قرآن میں بار بار مختلف انداز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مسلمانوں کو خارجی طاقت مغلوب نہیں کرسکتی۔ وہ جب بھی مغلوب ہوں گے تو اپنی داخلی کمزوری کی وجہ سے مغلوب ہوں گے۔ اگر ہم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ موجودہ صورتِ حال تمام تر مسلمانوں کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہے، نہ کہ اغیار کی دشمنی اور ان کی سازش کا نتیجہ۔

اصل یہ ہے کہ مسلمان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے نمائندہ کی ہے۔ ان کی یہ لازمی ڈیوٹی ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کے سامنے خدا کے دین کا اعلان واظہار کریں۔ وہ لوگوں کے اوپر خدا کے گواہ بنیں۔ اسی گواہی کی ادائیگی پر ان کی دنیا کی نجات کا انحصار ہے اور اسی طرح آخرت کی نجات کا انحصار بھی۔

مسلمان اگر اس کارِ شہادت یا کارِ دعوت کو چھوڑ دیں تو خدا کی نظر میں ان کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ اس کام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام، خواہ وہ کتنے ہی بڑے پیمانے پر کیا جائے، خدا کی نظر میں مسلمانوں کو قیمت والا نہیں بنا سکتا۔ اس مسئلے کی وضاحت کے لیے ایک عام مثال لیجیے۔

1962 کا واقعہ ہے۔ چین نے ہندستان کی مشرقی سرحد پر حملہ کر دیا۔ چینی فوجیں آسام کے علاقے میں گھس آئیں۔ اس وقت تیز پور (آسام) میں ایک ہندوستانی کمشنر تھا جو گویا وہاں ہندستان کا نمائندہ تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر حال میں وہاں موجود رہے، مگر وہ اپنا دفتر چھوڑ کر بھاگ گیا، اور اپنے وطن میں آ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے لگا۔ نئی دہلی کی حکومت کو معلوم ہوا تو اس نے کمشنر کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ اس پر سرکاری ڈیوٹی کو چھوڑنے کا مقدمہ چلایا گیا، اور اس کو سخت سزا دی گئی۔

بچوں میں رہنا یا اپنے گھر کا انتظام سنبھالنا، عام آدمیوں کے لیے بالکل جائز بات تھی۔ مگر کمشنر کے لیے یہی بات ناقابل معافی جرم بن گئی، کیوں کہ کمشنر کی قیمت "تیز پور" میں تھی، اس کی قیمت "گھر" کے اندر نہ تھی۔ اگر وہ اپنی ڈیوٹی کے مقام پر ٹھہرا رہتا تو وہ حکومت کا انتہائی مطلوب شخص بن جاتا۔ حکومت اس کو بچانے کے لیے اپنی پوری طاقت لگا دیتی۔ اس کے لیے خصوصی ہوائی جہاز بھیجے جاتے۔ مگر جب اس نے اپنی ڈیوٹی کی جگہ چھوڑ دی تو اس نے اپنی قیمت بھی کھو دی۔ اب وہ صرف ایک مجرم تھا۔ خواہ کسی اور میدان میں وہ کتنی ہی سرگرمی دکھا رہا ہو، خواہ وہ بظاہر مفید کام کیوں نہ کر رہا ہو۔

یہی موجودہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے، ان کے لیے نجات اور کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ دعوت الی اللہ اور شہادت علی النّاس والے کام کے لیے اٹھیں۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح خدا کی پکڑ کی زد میں آ جائیں گے جس طرح اس سے پہلے یہود آ گئے۔ اور اس کے بعد ان کی ساری سرگرمیاں بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گی، خواہ بطور خود انھوں نے اپنی سرگرمیوں کو کتنا ہی شاندار عنوان دے رکھا ہو۔

یہود کی مثال

بعثتِ محمدی سے پہلے قدیم زمانے میں یہود اسی دعوتِ توحید اور شہادتِ حق کے مقام پر کھڑے کیے گئے تھے۔ مگر انھوں نے غفلت برتی۔ انھوں نے اپنی ڈیوٹی کو انجام دینا چھوڑ

دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی نظر میں بے قیمت ہو گئے۔ خدا نے انہیں غیر اقوام کے حوالے کر دیا۔ ان کا یہ حال ہو گیا کہ وہ بڑے بڑے عمل کرتے تھے مگر ان کے عمل کا کوئی نتیجہ ان کے حصے میں نہ آتا تھا۔

بائبل کے آخری ابواب میں یہود کے اس انجام کا تفصیل سے ذکر آیا ہے۔ ان کے نبی بار بار انہیں اس غفلت پر تنبیہ کرتے ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں بائبل کا ایک پیرا گراف نقل کیا جاتا ہے:

"تب خداوند کا کلام حجّی نبی کی معرفت پہنچا کہ کیا تمہارے لیے مُسقّف گھروں میں رہنے کا وقت ہے جب کہ یہ گھر ویران پڑا ہے۔ اور اب رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ تم کھاتے ہو پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو پر پیاس نہیں بجھتی۔ تم کپڑے پہنتے ہو پر گرم نہیں ہوتے اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ اپنی روش پر غور کرو۔ پہاڑوں سے لکڑی لا کر یہ گھر تعمیر کرو اور میں اس سے خوش ہوں گا اور میری تمجید ہو گی خداوند فرماتا ہے۔ تم نے بہت کی امید رکھی اور دیکھو تھوڑا ملا اور جب تم اسے اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اُڑا دیا۔ رب الافواج فرماتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ میرا گھر ویران ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے گھر کو دوڑا چلا جاتا ہے، اس لیے نہ آسمان سے اوس گرتی ہے اور نہ زمین اپنا حاصل دیتی ہے۔" (حجّی، 1:1-10)

یہی موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا انجام نظر آتا ہے، انہوں نے بھی بہت بویا پر تھوڑا کاٹا۔ ان کی دھواں دھار تحریکوں اور بڑی بڑی کانفرنسوں کا حاصل عملاً اتنا کم ہے کہ ایسا معلوم ہوتا کہ گویا مسلمانوں کا ہر رہنما اپنی محنت کی کمائی کو سوراخ دار تھیلی میں جمع کر رہا ہے جو گھر پہنچتے پہنچتے گر جائے۔

دعوت شاہ کلید

دعوتی عمل کی حیثیت شاہ کلید یا کامل ضرب (master stroke) کی ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو پوری زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ جو ہر اعتبار سے انقلاب برپا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ داعی جب دعوت کے لیے اٹھتا ہے تو اس کا پورا ماحول اس کے لیے ایک سنجیدہ چیلنج بن جاتا ہے۔ یہ چیلنج اس کی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ وہ اس کی فکری اور اخلاقی تربیت کرتا چلا جاتا ہے۔

1۔ دعوت کا کام بظاہر دوسروں کے اوپر کیا جاتا ہے مگر اس سے پہلے وہ خود داعی پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ وہ داعی کے ایمانی شعور کو جگاتا ہے۔ اور اس کے سوئے ہوئے ایمان کو زندہ ایمان بنانے کا سبب بنتا ہے۔

جب ایک شخص ایک پیغام لے کر اٹھتا ہے اور اس کو دوسروں تک پہنچاتا ہے تو لازماً داعی اور مدعو کے درمیان گفتگو اور بحث چھڑتی ہے۔ سوالات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں، یہ چیز داعی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے پیغام کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرے۔ وہ اپنے آپ کو فکری اور نظریاتی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ مسلح کرے۔ اس طرح دعوت آدمی کو مطالعہ اور تیاری کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کا یہ مطالعہ اور تیاری اس کے ایمان کو بڑھاتا ہے اور مضبوط سے مضبوط تر کرتا چلا جاتا ہے۔

2۔ دعوت آدمی کو پرسکون دنیا سے نکال کر مقابلے کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ دعوتی مہم کے نتیجے میں بے شمار عملی تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ آدمی مجبور ہوتا ہے کہ وہ عملی اعتبار سے سوچے، عملی پروگرام بنائے۔ اس طرح وہ دن بدن ایک باعمل انسان بنتا چلا جاتا ہے۔ اس کے اندر وہ صفات پیدا ہونے لگتی ہیں جو عملی انسان کی صفات ہیں۔ مثلاً حقیقت پسندی، منصوبہ بندی، صبر و اعراض، تدریجی جدوجہد، حال کے ساتھ مستقبل کو دیکھنا، مسائل سے زیادہ مواقع پر دھیان دینا، وغیرہ۔

3۔ دعوتی عمل کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو دوامی ارتقا کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ داعی اور مدعو کے درمیان ٹکراؤ داعی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذہنی اور عملی اعتبار سے مدعو کے مقابلے میں فائق تر ثابت کرے۔ اس کے دلائل فریق ثانی کے دلائل سے زیادہ قوی ہوں۔ اس کی عملی تدبیریں فریق ثانی کی عملی تدبیروں پر سبقت لے جانے والی ہوں۔ یہ صورت حال داعی کو مستقل طور پر ایک قسم کے علمی اور عملی ارتقا کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔

4۔ دعوتی عمل کا ایک نہایت اہم اخلاقی فائدہ یہ ہے کہ وہ داعی کو ساری انسانیت کا خیر خواہ بنا دیتا ہے۔ اس کے تجربات بتاتے ہیں کہ وہ لوگوں کو محبت اور شیریں کلامی کے ذریعے جیت سکتا ہے، نہ کہ نفرت اور تلخ گوئی اور مشتعل مزاجی کے ذریعہ۔ یہ چیز اس کو لوگوں کے حق میں سراپا شفیق اور خیر خواہ بنا دیتی ہے۔ اس کا دعوتی عمل اس کے لیے عظیم اخلاقی تربیت بن جاتا ہے۔

ایک تاجر تجارت کرتا ہے تو اس کا تجارتی عمل عین اپنی فطرت کے نتیجے میں اس کو بردبار اور شیریں کلام بنا دیتا ہے۔ یہی معاملہ داعی کا ہے۔ جب ایک شخص دعوتی میدان میں داخل ہوتا ہے تو اس کام کے تقاضے کے تحت وہ اپنے آپ حسن اخلاق کا نمونہ بنتا چلا جاتا ہے، کسی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ خدا تجارت کو اپنا مبلغ بناتا ہے:

“God is making commerce His missionary.”

5۔ دعوت کے عمل کا ایک عظیم الشان فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے نئے نئے افراد کھنچ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں، اس طرح مسلم گروہ کو مسلسل وہ قیمتی چیز ملتی رہتی ہے جس کو نیا خون (new blood) کہا جاتا ہے۔

پانی اگر کسی گڑھے میں رک جائے تو کچھ دنوں کے بعد اس میں بدبو پیدا ہو جائے گی۔ مگر جاری پانی ہمیشہ تازہ پانی رہتا ہے، اس میں کبھی بدبو نہیں پیدا ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹھہرا ہوا پانی یکساں پانی ہوتا ہے۔ جب کہ چشمہ یا دریا کے جاری پانی میں ہر وقت پرانے پانی میں نیا پانی شامل ہوتا رہتا ہے۔

یہی معاملہ انسانی جماعت کا ہے۔ مسلمانوں کا کوئی گروہ اگر محدود قوم کی صورت اختیار کرلے تو وہ دھیرے دھیرے جامد گروہ بن جائے گا جو اعلیٰ انسانی اوصاف سے خالی ہوگا۔ مگر جب اس میں پرانے افراد کے ساتھ نئے افراد ملتے رہیں تو وہ مسلسل طور پر زندہ اور فعال گروہ بنا رہتا ہے۔ اب وہ بند گڑھا نہیں رہتا، بلکہ بہتا ہوا دریا بن جاتا ہے جس کی تازگی کبھی ختم نہ ہو، جس کی حرکت اور فعالیت ہمیشہ باقی رہے۔

آخری بات

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی تحریکیں حیرت انگیز طور پر انتہائی ناکامی کا شکار ہوئی ہیں۔ مسلمان جب بھی کوئی تحریک اٹھاتے ہیں تو خدا ان کے گھروندے کو ٹھوکر مار کر گرا دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ تمام سرگرمیاں خدا کی نظر میں بالکل نامطلوب ہیں۔ اس بنا پر وہ ان کو حرفِ غلط کی طرح مٹا رہا ہے۔ ایسا اس لیے ہے تاکہ مسلمان جاگیں اور اس اصل کام کے لیے سرگرم ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ کو اصلاً مطلوب ہے — شہادتِ حق اور دعوت الی اللہ، اپنے ربّانی معنی میں، نہ کہ موجودہ قومی اور سیاسی معنی میں۔

انا لکم ناصح امین

قدیم زمانہ میں جنوبی عرب (یمن) کے علاقے میں ایک قوم آباد تھی جو عاد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک خوش حال اور طاقتور قوم تھی اور اس کی راجدھانی یمن کا شہر حضر موت تھا۔ اس قوم میں بگاڑ پیدا ہوا تو اس کی اصلاح کے لیے ہود پیغمبر بھیجے گئے۔ غالباً یہ وہی پیغمبر ہیں جن کا نام بائبل میں حبر (Heber) آیا ہے۔ حضرت ہود نے اپنی قوم سے کہا:

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ۔ (7:68) یعنی، اے میری قوم، میں تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ اور امین ہوں۔

اس مضمون کی اور آیتیں بھی قرآن میں ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی کتاب کا داعی بننے کے لیے کسی شخص یا گروہ کے اندر دو خاص صفتیں ہونا ضروری ہیں — نُصح اور امانت۔

نصح کے معنی خیر خواہی کے ہیں۔ ایک حقیقی داعی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے دل میں اپنے مدعو کے لیے خیر خواہی کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ یہ جذبہ اتنا زیادہ بڑھا ہوا ہونا چاہیے کہ وہ یک طرفہ خیر خواہی کی حد تک پہنچ جائے۔ یعنی اگر داعی کو اپنے مدعو کی طرف سے اذیت پہنچے تب بھی وہ اس کا خیر خواہ بنا رہے۔ مدعو اگر اس سے نفرت کرے تب بھی اس کے دل میں اپنے مدعو کے لیے محبت کا جذبہ باقی رہے۔ وہ ردّ عمل کی روش سے بچتے ہوئے صبر کرے اور مدعو کی زیادتیوں سے اعراض (الاحزاب، 33:48) کرتے ہوئے اپنا دعوتی کام جاری رکھے۔

داعی کے لیے دوسری مطلوب چیز امانت ہے۔ داعی کو اپنا دعوتی کام جذبۂ امانت کے تحت کرنا چاہیے۔ یعنی اس احساس کے تحت کہ یہ دین خدا کی طرف سے اس کے پاس بطور امانت تھا۔ وہ اس کا اپنا سرمایہ نہ تھا، بلکہ خود مدعو کا سرمایہ تھا، جس کو وہ اس کے حق دار

تک پہنچا رہا ہے۔ مدعو کے اوپر دعوت کا کام کر کے اس نے صرف ایک خدائی ذمہ داری کو ادا کیا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور حیثیت اس کے عمل کی نہیں ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں نصح اور امانت کی یہ دونوں صلاحیتیں ختم ہو گئی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے اکابر تک کے اندر ان کا وجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں حقیقی دعوتی عمل کا ظہور نہ ہو سکا۔ یہاں اس کی وضاحت کے لیے ان دونوں پہلوؤں کی ایک ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔

احساس نصح کا فقدان

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی ایک کتاب سیرت کے موضوع پر ہے۔ اس کا نام سیرۃ المصطفیٰ ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی کے "کلمات بابرکات" بطور تصدیق شامل ہیں۔ یہ کتاب دوسری بار 1980 میں دیوبند سے شایع ہوئی ہے۔

مصنف نے ایک مقام پر ان لوگوں کا جواب دیا ہے جو اسلام میں قتال کو دفاعی سمجھتے ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ قتال (یا جہاد فی سبیل اللہ) ایک ہجومی اور اقدامی فعل ہے۔ وہ "قانونِ خداوندی کو علی الاعلان جاری کرنے کے لیے" کیا جاتا ہے، نہ کہ محض دشمنوں کے مقابلے میں اپنی حفاظت اور مدافعت کے لیے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کیا خلفاء راشدین کے تمام جہادات دفاع تھے۔ کوئی جہاد ان میں سے اقدامی نہ تھا۔ اور کیا سلاطینِ اسلام کے ہندستان پر حملے بھی اقدامی نہ تھے۔ ایک ہزار سال قبل کیا کسی لالہ رام اور دھوتی پرشاد کی مجال تھی کہ وہ کسی اسلامی حکومت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کا تصور بھی کر سکے اور شاہان اسلام ان کی مدافعت کے لیے اٹھیں۔" (صفحہ 10)

اس عبارت میں "لالہ رام اور دھوتی پرشاد" کا جو انداز ہے، وہ بتا رہا ہے کہ مصنف کے دل میں غیر قوم کے لیے کس قدر تحقیری اور غیر ہمدردانہ جذبہ بھرا ہوا ہے۔ یہی موجودہ زمانے کے تمام مسلمانوں کا حال ہے۔ اقوام غیر کے لیے ان کے سینے میں نفرت اور تحقیر کے سوا اور کچھ نہیں۔ موجودہ مسلمانوں کی تمام تقریروں اور تحریروں میں یہ جذبات دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے دوسری قوموں کے لیے نصح اور خیر خواہی کا جذبہ کھو دیا ہے۔ یہ احساس اتنا زیادہ عام ہے کہ شاید اس میں کوئی استثناء نہیں۔

اقوامِ غیر کے لیے اس غیر ہمدردانہ نفسیات کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے کہ ان کے لیے مسلمانوں میں کسی حقیقی دعوتی عمل کا ظہور ہو سکے۔

احساس امانت کا فقدان

پروفیسر مسعود الحسن (پاکستان) کی ایک انگریزی کتاب ڈاکٹر سَر محمد اقبال کے بارے میں ہے۔ اس کا نام ہے — حیات اقبال (Life of Iqbal)۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ سَر محمد اقبال 14 جنوری 1929ء کو بذریعہ ٹرین حیدر آباد پہنچے۔ وہاں ریلوے اسٹیشن پر ان کو شاہانہ استقبال دیا گیا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے طالب علموں نے اقبال کے اس شعر کو گا کر انہیں خراج تحسین پیش کیا:

چین و عرب ہمارا ہندستان ہمارا　　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

17-15 جنوری کو اقبال نے حسب ذیل موضوع پر عثمانیہ یونیورسٹی میں توسیعی لکچر دیے:

"Reconstruction of Religious Thought in Islam"

18 جنوری 1929 کو اقبال کی ملاقات نظام حیدر آباد سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران نظام

نے اقبال سے پوچھا کہ ہماری ریاست کے انتظام (ایڈمنسٹریشن) کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں۔ اقبال نے ریاست حیدرآباد کے انتظام کی تعریف کی۔

پھر اقبال نے کہا کہ مگر ایک چیز کو دیکھ کر مجھے سخت تکلیف پہنچی۔ نظام نے بے تابی کے ساتھ پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ اقبال نے کہا کہ آپ کا خاندان تین سو سال سے حیدرآباد پر حکومت کر رہا ہے۔ مگر آپ نے تبلیغ پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان یہاں بہت کم تعداد میں ہیں۔ نظام نے کہا کہ میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

اقبال نے جواب دیا کہ آپ کے اجداد کو اسلام کی تبلیغ میں حقیقی کوشش کرنا چاہیے تھا۔ وہ اس کو کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے نہیں کیا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب اگر اسلام کی اشاعت کے لیے کوئی کوشش کی جاتی ہے تو وہ پریشان کن ثابت ہوگی۔ نظام نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا کہ ہاں بات تو ایسی ہی ہے۔ اس کے بعد 19 جنوری 1929 کو اقبال حیدرآباد سے واپس ہو کر لاہور چلے گئے۔ مصنف کتاب کے الفاظ یہ ہیں:

"Iqbal said, "Your Exalted Highness, your dynasty has ruled over the State for the last three hundred years or so, but you paid little attention to the spreading of Islam. The result is that the Muslims are only a small percentage of the population. The Nizam said, "Yes, I understand your point. Could you suggest what should be done"The Allama said"Your Highness forefathers should have made real effort to spread Islam. They could have done that. Now it is rather late, and if any attempt is made to spread Islam that would be embarrassing. The Nizam sighed and said"yes, that is so."

اقبال کی یہ گفتگو بتاتی ہے کہ حیدرآباد کے غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ کا مسئلہ ان کے لیے مسلم سیاست کی توسیع کا مسئلہ تھا، نہ کہ حقیقی معنوں میں خدا کے پیغام رسانی کا مسئلہ۔ انہوں نے اس کو خود اپنے قومی مسئلے کے طور پر سوچا، نہ کہ مخاطب کی اپنی نجات کے مسئلے کے طور پر۔

یہ اندازِ فکر امانت کے تصور کے سراسر خلاف ہے۔ امین اور امانت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ میرے پاس جو دین ہے وہ خدا کی طرف سے خدا کے بندوں کی امانت ہے۔ مجھے اس امانت کو بہر حال اس کے حق دار تک پہنچانا ہے۔ اگر میں اس فرض کو ادا کیے بغیر مر گیا تو میں خدا کے یہاں غیر امین قرار پاؤں گا اور عدم ادائیگی فرض کے جرم میں پکڑا جاؤں گا۔ مگر اقبال اس انداز پر نہیں سوچتے۔ ان کے لیے دعوت محض مسلم قومی سیاست کا ایک ضمیمہ ہے، نہ کہ خود غیر مسلموں کے ایک حق کو غیر مسلموں تک پہنچانا۔

موجودہ زمانے میں یہی تمام مسلمانوں کا حال ہے۔ میں موجودہ زمانے کے معلوم اور معروف مسلمانوں میں کسی ایک شخص کو بھی نہیں جانتا جو اس معاملے کو امانت کا معاملہ سمجھتا ہو۔ جو اس احساس سے بے تاب ہو گیا ہو کہ یہ خدائی امانت اگر میں نے خدا کے بندوں تک نہ پہنچائی تو خدا کے یہاں میرا کوئی انجام نہیں۔

نصح اور امانت کا مذکورہ جذبہ داعی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں غیر اقوام کے لیے یہ جذبہ موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے درمیان حقیقی دعوت کا عمل بھی زندہ نہ ہو سکا۔ اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس نے موجودہ زمانے میں خدا کی نصرتوں کی بارش کو مسلمانوں کے اوپر سے روک رکھا ہے۔

سیف اللہ کا پیغام

ایک ہندوستانی عالم نے شام کا سفر کیا۔ وہاں کے شہر حمص میں مشہور صحابی رسول خالد سیف اللہؓ کی قبر ہے۔ موصوف کی ایک تقریر حمص میں ہوئی۔ مذکورہ ہندوستانی بزرگ اپنی سوانح حیات (مطبوعہ 1983) میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حمص کے مرکز اخوان المسلمین میں 29 جولائی 1951 کو میری ایک ولولہ انگیز تقریر ہوئی۔ میں نے کہا کہ شام وحمص کے رہنے والوں، عالم اسلام کو اب پھر ایک سیف اللہ کی ضرورت ہے۔ کیا آپ عالم اسلام کو اس کی کھوئی ہوئی تلوار مستعار دے سکتے ہیں۔" (صفحہ 290)

اس تقریر کو خطیبانہ لفاظی تو کہا جا سکتا ہے، مگر اس کو رہنمائی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ عالم اسلام کی آج جو حالت ہے، اس میں کسی "تلوار" کو برآمد کرنا اس کے مسئلہ کا حل نہیں۔ یہ تلوار پہلے ہی اس کے پاس کافی مقدار میں موجود ہے۔ آج عالم اسلام کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ تلوار نہیں، بلکہ خود خالد سیف اللہ کا وہ "بے تلوار" عمل ہے جو غزوۂ موتہ (8ھ) کے موقع پر سامنے آیا تھا۔ ان کا یہ دوسرا عمل ہمارے آج کے حالات سے زیادہ متعلق (relevant) ہے۔

تاریخی رہنمائی کے سلسلے میں ہمیشہ یہ بات جاننے کی ہوتی ہے کہ ماضی کے جس واقعے کو رہنما واقعے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، وہ ہمارے آج کے لیے کتنا موزوں اور مناسب ہے۔ اس طرح کے معاملے میں صرف تاریخ کا واقعہ بیان کر دینا کافی نہیں بلکہ ماضی اور حال کے درمیان موزونیت (relevance) کو جاننا بھی لازمی طور پر

ضروری ہے۔ تاریخ کوئی پوسٹج اسٹیمپ نہیں جس کو میز کے خانے سے نکال کر کسی بھی لفافے پر چسپاں کر دیا جائے۔

صلح حدیبیہ کا وقفۂ امن ملنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن حکمرانوں کے نام دعوتی خطوط بھیجے، ان میں سے ایک شرحبیل بن عمرو غسانی تھا۔ وہ قیصر روم کی طرف سے علاقۂ شام کا حاکم تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد حضرت حارث بن عمیر جب یہ خط لے کر شرحبیل کے پاس پہنچے تو اس کے پڑھنے کے بعد شرحبیل اس قدر غضب ناک ہوا کہ اس نے حضرت حارث کو قتل کر دیا۔

قاصدِ رسول کا یہ قتل سراسر ظلم تھا۔ بین اقوامی آداب کے مطابق وہ مدینہ کی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف کارروائی ضروری سمجھی۔ آپ نے تین ہزار افراد کا ایک لشکر تیار کر کے شام کی طرف روانہ فرمایا۔ اس لشکر میں بڑے بڑے صحابہ شامل تھے۔ آپ نے حضرت زید بن حارثہ کو اس لشکر کا امیر مقرر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر زید بن حارثہ قتل ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب امیر بنائے جائیں۔ اگر وہ بھی قتل ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیرِ لشکر ہوں۔ اگر وہ بھی قتل ہو جائیں تو اس کے بعد مسلمان جس کو چاہیں، اپنا امیر بنا لیں۔

یہ لوگ روانہ ہو کر شام کے ایک گاؤں تک پہنچے جس کا نام مؤتہ تھا۔ یہیں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ دوسری طرف غسانیوں اور رومیوں کی تعداد دو لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ اس انتہائی غیر مساوی مقابلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے تین سردار — زید بن حارثہ، جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن ابی رواحہ ایک کے بعد ایک شہید ہو گئے۔ آخر میں حسب ہدایتِ رسولؐ، مسلمانوں نے خالد بن الولید کو اپنا سردار مقرر کیا۔

خالد بن الولید نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ حتیٰ کہ اس دن ان کے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹ گئیں۔ مسلمانوں کے لشکر میں سے بارہ قیمتی جانیں ہلاک ہوگئیں۔ مگر جنگ کا فیصلہ نہ ہوسکا۔ یہاں تک کہ شام کا اندھیرا چھا گیا اور دونوں فریق اپنے اپنے فوجی ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔

حضرت خالد نے غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ موجودہ حالت میں رومیوں سے جنگ جاری رکھنا بالکل بے فائدہ ہے۔ کیوں کہ دونوں کی تقابلی تعداد اور ان کی نسبتی طاقت ناقابل عبور حد تک غیر مساوی ہے۔ چنانچہ انہوں نے لڑائی کو چھوڑ کر واپسی کا فیصلہ کیا۔ تاہم اس کے لیے انہوں نے ایک نہایت پُروقار جنگی تدبیر کی۔ انہوں نے اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس کے ایک حصہ کو سامنے کی طرف رکھا۔ اور اس کی ایک قابل لحاظ تعداد کو پیچھے جنگل کی آڑ میں چھپا دیا۔

صبح کا اجالا ہوا تو طے شدہ منصوبہ کے مطابق پیچھے چھپے ہوئے لوگ شور کرتے ہوئے اور نہایت بلند آواز سے نعرہ لگاتے ہوئے بڑھے اور آآ کر اگلی فوج سے ملنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر رومی فوج نے سمجھا کہ مدینہ سے مسلمانوں کے لیے نئی فوجی مدد آ گئی ہے۔ اب وہ مرعوب ہو کر مقابلہ کے میدان سے پیچھے ہٹ گئے تا کہ حالات کا جائزہ لیں اور اپنے آپ کو مزید تیار کر سکیں۔ حضرت خالد یہی چاہتے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی رومی فوج پیچھے ہٹی، حضرت خالد نے اپنی فوج کو مدینہ کی طرف واپسی کا حکم دے دیا۔ پسپائی کا الزام فریق ثانی پر ڈال کر انہوں نے جنگ ختم کر دی۔

خالد بن ولید اور ان کے ساتھی جب موتہ سے واپس ہو کر مدینہ پہنچے تو مدینہ کے کچھ مسلمانوں کو ان کی بغیر فتح واپسی ایک قسم کا فرار معلوم ہوئی۔ انہوں نے ان کے اوپر مٹی پھینکی اور مدینہ کی سرحد پر یہ کہہ کر ان کا استقبال کیا کہ اے بھاگنے والو، تم اللہ کے راستہ سے

بھاگ آئے: يَا فُرَّارُ، فَرَرْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تردید کی اور فرمایا:

لَيْسُوا بِالْفُرَّارِ، وَلَكِنَّهُمْ الْكُرَّارُ إِنْ شَاءَاللّٰهُ تَعَالَى۔ (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الثالث، صفحہ 438) یعنی، وہ بھاگنے والے نہیں ہیں۔ بلکہ اللہ نے چاہا تو وہ اقدام کرنے والے ہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی غزوۂ مؤتہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن الولید کو سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا لقب دیا تھا۔ گویا تلوار کو میان میں رکھ لیناوہ کارنامہ تھا جس کے بعد مذکورہ صحابی اللہ کی تلوار قرار پائے۔

مؤتہ کا سبق

غزوۂ مؤتہ میں بارہ مسلمان قتل ہوئے اور نو تلواریں ٹوٹ گئیں۔ اس کو امیری لشکر نے اتنا سنگین سمجھا کہ فوج کی واپسی کا حکم دے دیا۔ کیوں کہ صورت حال کے مطابق، اس وقت جنگ کو جاری رکھنا بے فائدہ بن چکا تھا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو دیکھیے۔ موجودہ زمانے میں بالاکوٹ مارچ (1831) سے لے کرا جو دھیا مارچ (1989) تک لاکھوں مسلمان مقابلہ آرائی میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور ساری دنیا کے لحاظ سے دیکھیے تو ہلاک ہونے والوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ جائے گی۔ اس درمیان میں جو بے شمار ''تلواریں'' ٹوٹی ہیں، ان کی تو کوئی گنتی ہی نہیں۔ اس کے باوجود کوئی نہیں جو اس بے فائدہ لڑائی کو روکنے کی بات کرے۔ ہر بولنے والا آدمی شمشیری زبان میں کلام کرنے کا بادشاہ بنا ہوا ہے۔

آج واقعات بار بار بتا رہے ہیں کہ جنگ اور تصادم کا طریقہ مسلمانوں کے لیے سراسر لاحاصل ہے۔ اس کے باوجود نام نہاد مسلم رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو

لڑنے پر اکسا رہے ہیں۔ وہ حمص اور دمشق کے مزارات سے خالد بن الولید اور صلاح الدین ایوبی کی تلوار برآمد کرنا چاہتے ہیں۔ تا کہ مفروضہ دشمنوں کے خلاف لڑائی جاری رکھی جا سکے۔

اس المناک کہانی کا مزید المناک باب یہ ہے کہ تلوار کا یہ لفظی کارخانہ وہ لوگ چلا رہے ہیں جنہیں خود لڑنا نہیں ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری صرف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ولولہ انگیز تقریریں کریں۔ اور دوسروں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بے فائدہ طور پر لڑ لڑ کر اپنے آپ کو ہلاک کرتے رہیں۔ کتنے ظالم ہیں وہ لوگ جن کا حال حضرت مسیح کے الفاظ میں یہ ہے کہ "وہ ایسے بھاری بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے، باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ ان کو اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔" (متی 4:23)

حقیقت یہ ہے کہ آج خالد بن الولید کے اس حکیمانہ عمل کو دہرانے کا وقت ہے جس کا مظاہرہ انہوں نے مؤتہ کے موقع پر کیا تھا۔ اگر موجودہ مسلمان ایسا کریں تو ممکن ہے کہ بعض ظاہر بیں افراد ان پر بزدلی کا الزام لگائیں اور انہیں "یَا فُرَّارُ" کہہ کر پکاریں۔ مگر یقین ہے کہ عین اسی وقت خدا اور رسول کی آواز یہ کہہ کر ان کے عمل کی تصدیق کر رہی ہو گی کہ: لَیْسُوا بِالْفُرَّارِ، وَلَکِنَّھُمْ الْکُرَّارُ إِنْ شَاءَاللّٰہُ تَعَالَی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مؤتہ کے موقع پر جن لوگوں نے رومیوں کے مقابلے میں تدبیری واپسی کا فیصلہ کیا تھا، انہیں لوگوں نے بعد کو تیار ہو کر دوبارہ اقدام کیا اور نہ صرف غسانیوں کو بلکہ پوری رومی بادشاہت کو مٹا ڈالا اور اسلامی عظمت کی ایک نئی تاریخ پیدا کر دی۔

موجودہ زمانے کے مسلمان واپسی کے لیے تیار نہیں ہوئے، اس لیے کوئی تاریخی اقدام بھی ان کے لیے مقدر نہ ہو سکا۔

"مؤتہ" کے محاذ سے واپس آنے والے ہی دوبارہ "مؤتہ" کے محاذ کو فتح کرتے ہیں — جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ ملت کی تاریخ میں صرف قبرستانوں کا اضافہ کریں گے، وہ

ملت کی عظمتوں کا مینار کھڑا کرنے والے نہیں بن سکتے۔

دعوت کا میدان

مسلمانوں کے لیے ساری دنیا میں کرنے کا کام صرف ایک ہے، اور وہ دعوت الی اللہ ہے۔ مسلمانوں کو پہلے بھی یہی کام کرنا تھا، مگر اب تو آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان ٹکراؤ کے میدان سے واپس ہو کر دعوت کے میدان میں اپنا عمل جاری کریں۔ وہ دوسری قوموں کو دشمن کی نظر سے دیکھنے کے بجائے انہیں اپنے مدعو کی نظر سے دیکھیں۔ وہ "تلوار" کے بجائے قرآن کو لے کر اٹھیں اور اقوامِ عالم کے اوپر اپنی داعیانہ ذمہ داریوں کو ادا کریں۔ اسی میں ان کی دنیا کی بھلائی ہے اور اسی میں ان کی آخرت کی بھلائی بھی۔

نارتھ امریکہ میں مسلمانوں کی ایک پرانی تنظیم ہے جو مختصر طور پر اسنا (ISNA) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا 26 واں اجلاس اوہایو اسٹیٹ میں ستمبر 1989 کے پہلے ہفتہ میں ہوا۔ اس اجلاس کی خاص تھیم یہ تھی کہ اسلامی دعوت کو لے کر باہر نکلو:

"Preaching out with Islam"

اسلامی عمل کے لیے یہ ایک صحیح عنوان ہے۔ تاہم اس جملے میں مجھے حریفانہ نفسیات کی بو آتی ہے۔ جب کہ اسلامی دعوت سرتاپا ایک نصیحت کا عمل ہے۔ وہ دوسروں کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہیں ہے، بلکہ دوسروں کی خیر خواہی کے لیے خدا کے حکم کے تحت متحرک ہونا ہے۔

آج ساری دنیا میں ایسی مسلم کانفرنسیں ہو رہی ہیں جن کا عنوان دعوت ہوتا ہے۔ ان میں سے بہت سی کانفرنسوں میں مجھے خود بھی شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر میں نے پایا ہے کہ ان کانفرنسوں میں اگر ایک طرف "دعوت" کی بات کی جاتی ہے تو اسی کے ساتھ ان میں "عداوت" کی باتیں بھی پرجوش طور پر جاری رہتی ہیں۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

موجودہ زمانے میں ہمارے لکھنے اور بولنے والے کثرت سے دعوت اور داعیانہ مقام کے الفاظ لکھنے اور بولنے میں مصروف ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ہر ایک کے یہاں احتجاج اور فریاد، غصہ اور نفرت، حتیٰ کہ ٹکراؤ اور تصادم کی باتیں بھی پورے زور وشور کے ساتھ جاری ہیں۔ حالانکہ دونوں چیزوں میں اتنا زیادہ دوری ہے کہ جہاں ایک چیز ہو وہاں کبھی دوسری چیز جمع نہیں ہوسکتی۔

اس تضاد اور ذہنی انتشار کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے یہاں دعوت ان کی قومی مہم کے ضمیمہ کے طور پر آئی، نہ کہ حقیقتاً پیغمبرانہ ذمہ داری کے طور پر۔ مسلمان ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت سے احساس شکست میں جی رہے تھے۔ اپنے "دشمنوں" کے خلاف ان کی تمام لڑائیاں یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی بربادی پر ختم ہو رہی تھیں، وہ محسوس کر رہے تھے کہ دوسری قوموں نے انھیں علمی، تہذیبی، اقتصادی، سیاسی، ہر اعتبار سے بہت زیادہ پیچھے دھکیل دیا ہے۔

ایسی حالت میں کچھ مسلمانوں کو اسلام کی نظریاتی برتری میں اپنی قومی نجات نظر آئی۔ وہ دعوت اور داعی کے الفاظ بول کر یہ تسکین حاصل کرنے لگے کہ ہم دوسری قوموں سے پیچھے نہیں ہیں، بلکہ ان سے بہت آگے ہیں۔ مسلمانوں کے ایک طبقے میں دعوت کا جو رجحان پیدا ہوا ہے، وہ حقیقتا داعیانہ ذہن کے تحت نہیں بلکہ قومی ذہن کے تحت پیدا ہوا ہے۔ انھوں نے دعوت کی صورت میں اپنے فخر (pride) کو دریافت کیا ہے۔ انھوں نے دعوت کی صورت میں اپنی ذمہ داری (responsibility) کو دریافت نہیں کیا جو کہ دعوت کا اصل خلاصہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ جب دعوت کے موضوع پر بولتے ہیں تو ایسی باتیں کہتے ہیں جن کا قرآن و حدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ دعوت کو ریولیوشن اورنیٹڈ (revolution-oriented) ہونا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ دعوت کو

پالیٹکس اورینٹڈ، (politic-oriented) ہونا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ دعوت کو سسٹم اورینٹڈ (system-oriented) ہونا چاہیے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا ایک ہی صحیح طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ آخرت اورینٹڈ (akhirat-oriented) ہو۔ یعنی قرآن کے الفاظ میں، یوم آلازفہ (المؤمن، 18:23) سے ڈرانا۔ موت کے بعد آنے والے سنگین مسئلہ سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔ یہی دعوت الیٰ اللہ کا اصل مقصد ہے۔ اس کے سوا اگر کچھ ہے تو وہ اس کے اضافی اجزاء ہیں، نہ کہ اس کے حقیقی اجزاء۔

ان مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ''داعی'' ہونے کو جانا مگر انھوں نے دوسروں کے ''مدعو'' ہونے کو دریافت نہیں کیا۔ وہ اپنے حقوق کی فہرست سے مبالغہ آمیز حد تک واقف ہیں، مگر فریق ثانی کے بارے میں وہ ضروری حد تک بھی اپنی ذمہ داریوں کو نہیں جانتے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی دعوت ذاتی فخر کا اظہار تو ہے مگر وہ صبر و اعراض کا جہاد نہیں۔ اس میں اپنی برتری کی تسکین ہے مگر اس میں تواضع کی نفسیات نہیں۔ اس میں دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کا جوش ہے مگر اس میں دوسروں کو ہدایت طلبی کی تڑپ نہیں۔ اس کے اندر ''میں'' کی پوری رعایت پائی جاتی ہے مگر اس ک اندر ''وہ'' کی کوئی رعایت موجود نہیں۔

ایسا عمل ایک قومی عمل تو ہو سکتا ہے، مگر وہ کوئی دعوتی عمل نہیں۔ ایسے عمل سے ان نتائج کی امید نہیں کی جا سکتی جو ایک حقیقی دعوتی عمل کے لیے خدا کی طرف سے مقرر کی گئی ہیں۔

ایک سفر میں میری ملاقات کچھ لوگوں سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ یہ جانیں کہ ان کا تعلق دوسری قوموں کے ساتھ داعی اور مدعی کا ہے، نہ کہ حریف اور رقیب کا۔ ایک صاحب نے

میری بات سن کر کہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ آج کل تو سبھی لوگ داعی اور دعوت کی باتیں کر رہے ہیں۔ موجودہ مسلمان اس کی اہمیت سے غافل نہیں۔

میں نے کہا کہ جن لوگوں کی بابت آپ فرما رہے ہیں وہ اس معاملے میں ابھی صرف آدھی بات سے واقف ہیں۔ انہوں نے "داعی" کے معاملے کو تو جانا ہے، مگر انہوں نے "مدعو" کے معاملے کو ابھی تک نہیں جانا۔ میں نے کہا کہ دعوت کوئی تقریری نمائش یا قومی فخر کے اظہار کا نام نہیں۔ دعوت ایک انتہائی سنجیدہ عمل ہے۔ دعوت کی اصل بندوں کی خیر خواہی ہے جس کو قرآن میں نصیحت کہا گیا ہے۔ (الاعراف، 69-6:68)

موجودہ زمانے کے مسلمان ایک بے برداشت قوم ہیں۔ جب کہ داعی از اول تا آخر ایک برداشت کرنے والی شخصیت ہوتا ہے۔ موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ تمام قوموں کو اپنا حریف اور رقیب بنائے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی حقیقی دعوتی عمل کا وجود میں آنا ممکن نہیں — مدعو کو اپنا محبوب بنانا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی دعوت کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔

سبب اپنے اندر

سترھویں صدی مسلمانوں کے عروج کی آخری صدی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی چار بڑی حکومتیں قائم تھیں جو دنیا بھر میں مسلم طاقت کا نشان بنی ہوئی تھیں۔ انہیں میں عثمانی خلافت بھی تھی جو بغداد سے الجزائر تک، اور پھر عدن سے ہنگری تک پھیلی ہوئی تھی:

برصغیر ہند میں مغل سلطنت (Mughal dynasty)

ایران میں صفوی سلطنت (Safavid dynasty)

مراکش میں علوی سلطنت (Alwai (Filali) dynasty)

ترکی میں عثمانی سلطنت (Ottoman Empire)

اٹھارویں صدی کے آغاز سے ان حکومتوں پر زوال شروع ہوا۔ عین اسی وقت سے احیاء وتجدید کی تحریکیں بھی جگہ جگہ شروع ہوگئیں۔ اب ان تحریکوں پر تقریباً تین سو سال کی مدت گزر چکی ہے۔ مگر یہ تحریکیں نہ مذکورہ سلطنتوں کے زوال کو روک سکیں اور نہ مسلمانوں کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے میں کامیاب ہوئیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے بغداد کی عظیم مسلم سلطنت کو تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد سو سال کے اندر مسلمانوں نے دوبارہ عزت وسربلندی کے مقام کو پالیا۔ مگر موجودہ زمانے میں بے شمار قائدوں اور بزرگوں کی تین سو سالہ جہد وجہد بھی ناکامی کی تاریخ کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہ کرسکی۔

اصل یہ ہے کہ زوال کے پچھلے تمام واقعات زیادہ تر جارحیت غیر کے واقعات تھے۔ اس لیے اغیار کے حملے کا مقابلہ کر کے ابتدائی صورت حال کو دوبارہ بحال کرلیا گیا۔ مگر موجودہ زمانے کا زوال خود مسلمانوں کے فکری اور ایمانی انحطاط کے نتیجے میں پیش آیا۔ اب ضرورت

تھی کہ مسلمانوں کے اندر فکری انقلاب اور ایمانی حرارت پیدا کرنے سے اپنی کوشش کا آغاز کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کے تمام رہنما بدستور اغیار کے حملوں کو سبب زوال قرار دے کر ان سے بے فائدہ لڑائی لڑتے رہے۔ جب بیج ہی نہ ڈالا گیا ہو تو درخت کہاں سے اُگے گا۔ چنانچہ بے شمار قربانیوں کے باوجود احیاءِ ملّت کا خواب بھی پورا نہیں ہوا۔

تقریباً 300 سال سے مسلمانوں کے اوپر دفاعی ذہن چھایا ہوا ہے۔ ان کے رہنماؤں کی بیشتر سرگرمیوں کا نشانہ کسی نہ کسی بیرونی خطرہ کا دفاع ہوتا ہے۔ اس مدت میں ہر رہنما کی سوچ، خارج رخی رہی ہے۔ اگر کسی نے داخلی انداز سے سوچا ہے تو وہ بھی اپنی عمر کے آخری حصہ میں، جب کہ وہ قبر کے کنارے پہنچ چکا تھا، اور اس کے لیے مزید کام کرنے کا موقع ختم ہو چکا تھا۔

دفاعی کام، خواہ وہ کتنا ہی ضروری ہو، بہرحال وہ وقتی ہوتا ہے۔ دفاعی کام کسی بھی حال میں تعمیر کام کا بدل نہیں۔ اصل کام بہرحال وہ ہے جو مسلمانوں کے داخلی تعمیر کے محاذ پر مثبت انداز میں کیا جائے۔ مگر سیاسی زوال کے دور سے لے کر اب تک مسلمانوں میں کوئی بھی قابل ذکر گروہ نظر نہیں آتا جو حقیقی طور پر داخلی تعمیر کے میدان میں سرگرم ہوا ہو۔

بیرونی خطرات اور مسائل کی موجودگی اس کوتاہی کے لیے کافی عذر نہیں۔ کیوں کہ موجودہ امتحان کی دنیا میں خطرات اور مسائل ہمیشہ باقی رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ باقی رہیں گے۔ موجودہ دنیا میں بیرونی مسائل کے باوجود داخلی تعمیر کا کام کرنا پڑتا ہے۔ منفی اسباب کے باوجود مثبت عمل کے راستہ پر سرگرم ہونا پڑتا ہے۔ یہاں کامیابی صرف اس کے لیے ہے جو خارجی حملوں کے باوجود اپنی ساری توجہ داخلی محاذ پر لگا دے۔

اگر "باوجود" کے اس اصول کا لحاظ نہ کیا جائے تو صدیاں گزر جائیں گی اور مثبت کام کبھی شروع نہ ہو سکے گا۔ اور مثبت تعمیری عمل کے بغیر ملت کا احیاء ممکن نہیں۔ خارجی دفاع کی کوئی بھی مقدار داخلی تعمیر کا بدل نہیں بن سکتی۔

ایک مثال

عُرابی پاشا (1839-1911) مصر کے ایک سیاسی لیڈر تھے۔ ان کا نعرہ تھا: مصر للمصریین (مصر مصریوں کے لیے)۔ ان کے زمانے میں مصر میں خدیو اسماعیل پاشا کی حکومت تھی۔ انہوں نے خدیو کو غدار قرار دیا۔ ان کو یہ شکایت تھی کہ خدیو اسماعیل پاشا مغربی طاقتوں کا ایجنٹ ہے۔ چنانچہ انہوں نے خدیو اسماعیل پاشا کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ 1881 کا واقعہ ہے۔ مگر ان کی بغاوت مکمل طور پر ناکام رہی۔ خدیو اسماعیل پاشا نے اپنے بچاؤ کے لیے برطانیہ سے مدد مانگی۔ برطانیہ نے فوراً ان کی پکار پر لبیک کہا۔ چنانچہ برطانی فوجوں کی مدد سے بغاوت کچل دی گئی اور عُرابی پاشا کو گرفتار کر لیا گیا۔ مزید یہ ہوا کہ 1882 میں مصر پر برطانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا۔

اس بغاوت میں عُرابی پاشا کا جن لوگوں نے ساتھ دیا ان میں فوجی لوگوں کے علاوہ مشہور دینی مصلح شیخ محمد عبدہ، (1849-1905) اور ان کے ساتھی بھی شامل تھے۔ تاہم شیخ محمد عبدہ اور ان کے ساتھیوں کی شمولیت کے باوجود بغاوت کامیاب نہ ہو سکی۔ "اسلام" کو مصر کا تخت دلانے کی کوشش میں "انگریز" مصر کے تخت پر قابض ہو گئے۔

شیخ محمد عبدہ اسلام کے علم بردار تھے۔ دوسری طرف انگریز غیر اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔ مگر اس کے مقابلے میں اسلام کے علم بردار مکمل طور پر ناکام رہے۔ اور غیر اسلام کے علم برداروں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

یہ ایک واضح مثال تھی کہ محض اسلام کے نام پر جھنڈا لے کر اٹھنا مقابلہ کی اس دنیا میں کامیابی کی ضمانت نہیں ہے۔ کامیابی کے لیے حقیقی حالات کی مساعدت بھی ناگزیر طور پر ضروری ہے۔

مگر عجیب بات ہے کہ اسی مصر میں ٹھیک یہی ناکام کہانی دوبارہ 1952 میں دہرائی

گئی۔ 1881 کے اسلامی جہاد کا نشانہ خدیو اسماعیل پاشا تھا۔ اور 1952 کے "اسلامی جہاد" کا نشانہ شاہ فاروق الاول تھا۔ پہلے جہاد کے قائد عُرابی پاشا تھے اور ان کے ساتھ مفتی محمد عبدہ، اور ان کی جماعت شریک تھی۔ دوسرے جہاد کے قائد جمال عبدالناصر تھے اور سید قطب اور ان کی جماعت حامیِ انقلاب بن کر ان کے ساتھ شریک ہو گئی۔ مگر جو انجام پہلے جہاد کا ہوا تھا، عین وہی انجام دوسرے جہاد کا بھی ہوا۔

ان دونوں کوششوں میں ظاہری اعتبار سے بعض فرق تھے۔ مگر جہاں تک "اسلامی مجاہدین" کا تعلق ہے، دونوں مواقع پر ان کا بالکل یکساں انجام ہوا۔ غیر اسلامی عناصر دونوں بار غالب رہے اور مسلم مجاہدین دونوں بار مکمل طور پر ناکامی کا شکار ہو کر رہ گئے۔

یہی کہانی زیادہ بری شکل میں پاکستان میں دہرائی گئی ہے۔ پاکستان میں سابق صدر جنرل محمد ایوب خاں کو اسلام کی راہ میں اصل رکاوٹ سمجھ لیا گیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے اسلام پسند ساتھی تنہا اپنی طاقت سے اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دوسری طاقتوں کو ساتھ لے کر ایوب خاں کو تخت سے بے دخل کرنے کی مہم چلائی۔ اس مہم کو وہ اتنا زیادہ ضروری سمجھتے تھے کہ ایوب خاں کے مقابلے میں انہوں نے ایک خاتون کو صدر کی حیثیت سے کھڑا کیا۔ حالانکہ حدیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ کوئی خاتون حکمران کسی ملک یا قوم کی فلاح کی طرف نہیں لے جا سکتی (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4425)۔ مگر جب یہ مہم کامیاب ہوئی تو صدر ایوب کی جگہ دوسرے "اسلام دشمن افراد" ملک کے حکمراں بن چکے تھے۔ یہی مہم دوبارہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف شروع کی گئی۔ اسلام پسندوں اور غیر اسلام پسندوں کی متحدہ کوشش سے مسٹر بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ مگر اس کے باوجود "غیر اسلام" کو پھانسی پر چڑھانا ممکن نہ ہو سکا۔ وہ بھٹو کے خاتمہ کے بعد بھی پاکستان میں پوری طرح زندہ ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مومن ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا: الْمُؤْمِنُ لا يلدغ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَيْنِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6133)۔ اس لحاظ سے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کہ مسلم رہنما ایک ہی غلطی کو بار بار دہراتے رہیں۔ مگر مذکورہ مثالیں حیرت انگیز طور پر بتاتی ہیں کہ وہ ایک ہی سیاسی بل سے بار بار ڈسے جارہے ہیں۔ وہ ایک ہی ناکام سیاسی تجربے کو بار بار دہرائے چلے جارہے ہیں۔ خدا کے دین کی یہ کیسی عجیب عملی تفسیر ہے جس کو موجودہ زمانے کے مسلم رہنما دنیا کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ اگر وہ کرنا نہیں جانتے تو کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کچھ نہ کریں۔ اگر انہیں بولنا نہیں آتا تو کیا انہیں یہ بھی نہیں آتا کہ وہ اپنی زبانوں کو بند رکھیں۔

آہ وہ لوگ، جنہیں کرنا نہیں آتا۔ پھر بھی وہ کرتے ہیں۔ جنہیں بولنا نہیں آتا پھر بھی وہ بولتے ہیں، صرف اس لیے کہ جو مواقع کار ابھی باقی ہیں وہ سبھی باقی نہ رہیں، یہاں تک کہ نہ کسی کے لیے کرنے کا کچھ موقع ہو اور نہ کچھ بولنے کا۔

موعود نہ کہ مقصود

قرآن کی سورۃ نمبر 24 میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک سنت کا ذکر اس طرح کیا ہے— تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، ان سے اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ (با اقتدار) بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اس نے اقتدار دیا تھا۔ اور اللہ ان کے لیے ان کے دین کو جما دے گا جس کو ان کے لیے اس نے پسند کیا ہے۔ اور اللہ ان کی خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد انکار کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔ (24:55)

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار یا غلبہ ایک امرِ موعود ہے، نہ کہ امرِ مقصود۔ یعنی وہ اہلِ اسلام کے عمل کا نشانہ نہیں ہے۔ اہلِ اسلام کے لیے ان کے عمل کا نشانہ تو ایمان اور عمل صالح ہے۔ ان کی اپنی توجہ شروع سے آخر تک اسی پر مرتکز رہنا چاہیے۔ البتہ جب اہل اسلام یہ شرط پوری کر دیں۔ وہ ایمان والی نفسیات اور عمل صالح والی زندگی کے ساتھ دنیا میں رہنے لگیں تو اللہ اگر چاہتا ہے تو ان کو ایک ملک یا زیادہ ملک میں حکومت وسلطنت بھی دیدیتا ہے۔ اہل اسلام کی ذمہ داری ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرنا ہے۔ اس کے حقیقی اور ابدی انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ انہیں جنتوں کے اندر داخل فرمائے گا، تاہم اس کے ابتدائی انعام کے طور پر وہ انہیں دنیا میں بھی غلبہ عطا کر دیتا ہے، اگر وہ چاہے۔

اس آیت میں جس اسلامی عمل اور جس خدائی انعام کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا نمونہ دور اول میں انتہائی کامل اور تاریخی صورت میں قائم کر دیا گیا ہے۔ اب جو شخص اس آیت کو یا اس آیت میں بیان کردہ قانونِ الٰہی کو سمجھنا چاہیے، اس کو اسلام کے دور اول کی تاریخ پڑھنا چاہیے۔ رسول اور اصحاب رسول کی زندگیوں کا مطالعہ کر کے وہ بخوبی طور پر جان سکتا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کیا ہے، اور مومنین صالحین کو خلیفہ (بااقتدار) بنانا کیا۔

ایمان اور عمل صالح کا وہ کون سا کردار تھا جس کا ثبوت دوراول کے اہل اسلام نے دیا اور جس کے بعد ان کے لیے خلافت (اقتدار) کے دروازے کھلے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اسلام کے اس دور کا مطالعہ کرنا چاہیے جس کو مکی دور کہا جاتا ہے۔ مدنی دور کو اگر "خلافت" کا دور کہا جائے تو مکی دور گویا "ایمان اور عمل صالح" کا دور تھا۔ یہی دوراول تھا جس نے ان کے لیے دورثانی کا استحقاق پیدا کیا۔

مکی دور کیا تھا۔ مکی دور شعوری انقلاب کا دور تھا۔ اس وقت جو لوگ ایمان لائے، ان کے لیے ایمان ایک عظیم الشان قربانی تھی۔ انھوں نے اپنے میں سے اور اپنے جیسے ایک

شخص کواس کے اندرونی جوہر کی بنا پر پہچان کر یہ اقرار کیا کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے۔ کسی غرض اور مفاد کے بغیر، خالص اصول کی خاطر، وہ اپنی قوم سے کٹ گئے۔ انہوں نے مکمل طور پر اپنے آپ کو بامقصد انسان ثابت کیا۔

انہوں نے ایک خدا کی پرستش کی۔ انہوں نے ایک اَن دیکھے خدا کو اپنا سب بنا لیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو قومی اکابر کی عظمت کے خول سے نکالا اور خدائے واحد کی عظمت میں اپنے آپ کو گم کر دیا۔ انہوں نے اپنی ساری توجہ اور سارے جھکاؤ کو صرف خدا کے لیے خاص کر دیا۔ وہ خدا کے لیے جئے اور خدا ہی کی راہ میں اپنی جان دی۔

انہوں نے اپنے ماحول میں اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دیا۔ وہ لوگوں کے خیر خواہ بنے، چاہے وہ ان کے ساتھ بدخواہی کریں۔ انہوں نے لوگوں کی امانتیں پوری پوری ادا کیں، خواہ لوگ ان کے ساتھ خیانت کا معاملہ کر رہے ہوں۔

انہوں نے لوگوں کے ساتھ بہترین اخلاقی سلوک کیا، خواہ وہ ان کے ساتھ کتنی ہی زیادتیاں کیوں نہ کریں۔ انھوں نے اس اعلیٰ عمل کا ثبوت دیا جس کو یک طرفہ اخلاق اور یک طرفہ صبر کہا جاتا ہے۔

انہوں نے اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہیں کی، بلکہ ان کے حق میں دعائیں دیں۔ لوگوں نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔ اس کے باوجود انہوں نے ان سے انصاف اور حق پرستی کے مطابق معاملہ کیا۔ وہ صرف اچھوں کے لیے اچھے نہیں بنے بلکہ بروں کے ساتھ بھی انہوں نے نیکی اور بھلائی کی روش اختیار کی۔ انہوں نے جوابی اخلاق کے بجائے یک طرفہ حسنِ اخلاق کو اپنا طریقہ بنایا۔

انہوں نے اپنے مسلسل عمل سے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ اپنے مخالفین کے معاملے میں بھی انصاف پر قائم رہنے والے ہیں۔ دوسروں کو تولنے کے لیے بھی ان کے پاس وہی

ترازو ہے جو اپنے آپ کو تولنے کے لیے ہے۔ وہ غصہ کو برداشت کرتے ہیں۔ وہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرتے ہیں۔ وہ ہر اعتبار سے صالح ٹھہرے۔ وہ ہر جانچ میں ربّانی کردار والے ثابت ہوئے۔

ایمان اور عملِ صالح کے اس معیار پر جب وہ پورے اترے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے دنیا کی عزت بھی لکھ دی اور آخرت کی ابدی عزت اور کامیابی بھی۔

چالیس سالہ انتظار

قرآن میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے—

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، اس پاک زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ اور اپنی پیٹھ کی طرف نہ لوٹو، ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے۔ انہوں نے کہا کہ وہاں ایک زبردست قوم ہے۔ ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم داخل ہوں گے۔ دو آدمی جو اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے اور ان دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا، انہوں نے کہا کہ تم ان پر اقدام کرکے شہر کے پھاٹک میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم اس میں داخل ہو جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو گے۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو۔ انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ ہم کبھی وہاں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں ہیں۔ پس تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب، اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر میرا اختیار نہیں۔ پس تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی کر دے۔ اللہ نے کہا کہ وہ ملک ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دیا گیا۔ یہ لوگ زمین میں بھٹکتے پھریں گے۔ پس تم اس نافرمان قوم پر افسوس نہ کرو۔ (المائدہ، 5:21-26)

یہ واقعہ زیادہ تفصیل کے ساتھ بائبل (گنتی، استثنا، یشوع) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بائبل کے علما کے مطابق، حضرت موسیٰ 1440 ق م میں بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے خدا کے حکم کے تحت بنی اسرائیل سے یہ بات کہی کہ شام و فلسطین کی زمین خدا نے تمہارے لیے مقدر کی ہے۔ تم اقدام کر کے وہاں داخل ہو جاؤ۔

اس علاقے میں اس وقت عمالقہ (Amalekites) کی حکومت تھی۔ بنی اسرائیل ان سے ڈر رہے تھے۔ چنانچہ وہ اقدام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے علاوہ صرف دو آدمی ایسے تھے جنہوں نے اٹھ کر اس اقدام کی تائید کی۔ بائبل میں ان کا نام یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا بتایا گیا ہے۔

بنی اسرائیل نے جب اس معاملے میں پست ہمتی کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے عمالقہ کے ملک میں داخلے کے منصوبے کو چالیس سال تک کے لیے مؤخر کر دیا۔ بنی اسرائیل کے متعلق خدا کا حکم ہوا کہ ''تمہاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی۔ اور تمہاری ساری تعداد میں سے بیس برس سے لے کر اس سے اوپر اوپر کی عمر کے تم سب جتنے گنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے، ان میں سے کوئی اس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا، جانے نہ پائے گا'' (گنتی 30-29:14)

اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ بنی اسرائیل کے تمام زیادہ عمر کے لوگ ختم ہو جائیں، اور صرف وہ نئی نسل باقی رہے جو سینا کے صحرائی ماحول میں پرورش پا کر بڑی ہوئی ہے، اس وقت وہ عمالقہ کے اوپر جہاد کریں اور خدا کی مدد سے کامیابی حاصل کریں۔

خدا کے اس حکم کے مطابق بنی اسرائیل صحرا میں پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ تقریباً چالیس سال میں جب ایسا ہوا کہ پرانی نسل ختم ہوگئی اور نئی نسل بن کر تیار ہوگئی تو انھوں نے عمالقہ کے ملک (شام و فلسطین) میں جہاد کیا۔ یہ جہاد 1400 ق م میں مذکورہ یوشع بن نون کی قیادت میں انجام پایا۔ اور اللہ کی مدد سے کامیاب ہوا۔

اس واقعے پر غور کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کی براہ راست وحی کے تحت جہاد کا ایک حکم سامنے آتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس پر عمل کو چالیس سال تک کے لیے مؤخر کر دیا جاتا ہے، صرف اس لیے کہ جن لوگوں کو جہاد کرنا تھا، ان کے اندر جہاد کی استعداد ثابت نہ ہوسکی۔

اگرچہ کم از کم چار آدمی (موسیٰ، ہارون، یوشع، کالب) جہاد کے لیے پوری طرح تیار تھے جن میں دو پیغمبر بھی تھے۔ مگر فریق ثانی کے مقابلے میں یہ تعداد ناکافی تھی، اس لیے جہاد کو ملتوی کر دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاد اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی انجام کی پروا کیے بغیر مقابلے کے میدان میں کود پڑے، خواہ اس کے نتیجے میں یک طرفہ طور پر اس کی ہلاکت ہی کیوں نہ ہونے والی ہو۔ جہاد کا مقصد نتیجہ حاصل کرنا ہے، نہ کہ لڑ کر مر جانا۔ اگر حالات کے اعتبار سے ضروری اسباب موجود نہ ہوں تو لازم ہے کہ آدمی جہاد سے رک جائے۔ وہ افراد کے اندر مطلوبہ استعداد پیدا ہونے کا انتظار کرے، خواہ اس انتظار کی مدت چالیس سال تک کیوں نہ وسیع ہو رہی ہو۔

ابتدائی عمل

کپڑے کی صنعت سے جو بے شمار کام متعلق ہیں ان میں سے ایک اہم کام کپڑے کی رنگائی ہے۔ مثلاً بہت سی ساڑیاں ابتداءً کپاس کے سادہ رنگ میں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ان پر رنگ چڑھا کر ان کو جاذب بنایا جاتا ہے۔ رنگائی کا یہ کام اس طرح نہیں ہوتا کہ بنی ہوئی ساڑی کو لے کر رنگ کے حوض میں ڈال دیا۔ اگر ایسا کیا جائے تو کبھی اچھا رنگ نہیں آئے گا۔ رنگائی کرنے سے پہلے سادہ ساڑی کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ تیاری کے اس عمل کی تکمیل کے بعد ہی کپڑا اس قابل ہوتا ہے کہ اس کو رنگائی کے آخری مرحلہ میں داخل کیا جائے۔

اس پیشگی عمل کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً کپڑے کو نرم کرنا، داغ دھبہ مٹانا، اس کو سفید بنانا۔ اس سے کپڑے کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ رنگ کو زیادہ سے زیادہ جذب کر سکے۔ ان پیشگی تیاریوں کا، بعد کی رنگائی اور چھپائی سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ یہ

معلوم کیا گیا ہے کہ رنگے ہوئے کپڑوں کی 70 فیصد خرابیوں کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ابتدائی کپڑے کو ناقص طور پر تیار کیا گیا تھا:

> "These pretreatments have a major role on subsequent dyeing, printing and finishing of cotton fabrics. In fact, it has been reported that 70%of all the defects occurring on dyed-finished fabrics could be attributed to the imperfect preparation of the base fabrics."
>
> (*Monthly Colourage*, December 1,1983)

کپاس اور کپڑے کا یہ مزاج براہ راست خداوند عالم کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یہ ایک عالمی قانون ہے جس سے موافقت کرکے انسان اپنی پسند کے کپڑے تیار کرتا ہے۔ اس طرح گویا خدا نے ایک نشانی قائم کردی ہے جو بتا رہی ہے کہ زندگی کی تعمیر کے لیے ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ زندگی کی تعمیر میں بھی ضروری ہے کہ پہلے تیاری کے مراحل طے کیے جائیں۔ تیاری کی شرطیں پوری کرنے کے بعد ہی وہ وقت آتا ہے جب کہ اگلے مرحلے کی طرف پیش قدمی کی جائے اور وہ کامیابی حاصل کی جائے جو مطلوب ہے۔ ابتدائی مراحل طے کیے بغیر کبھی آخری منزل نہیں آتی۔

وقفۂ تعمیر

کائنات خدا کی خاموش کتاب ہے۔ وہ ربّانی حقیقتوں کی تمثیل کے روپ میں بیان کرتی ہے۔ آدمی اگر کائنات کی خاموش زبان کو سن سکے تو وہ اس کے لیے معرفت کا عظیم ترین کتب خانہ بن جائے۔

درخت کو دیکھیے۔ درخت زمین سے نکلتا ہے تو وہ کمزور پودے کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے تنہ میں ابھی طوفان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اس وقت درخت کیا کرتا ہے۔

وہ سراپا نرمی بن جاتا ہے۔ ہواؤں کے جھونکے آتے ہیں تو وہ ان کے مقابلے میں اکڑتا نہیں، بلکہ ہوا کا جھونکا اس کو جس طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ اسی طرف چلا جاتا ہے۔ وہ حالی کی زبان میں، ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کی تصویر بن جاتا ہے۔

مگر اسی پودے کو 25 سال بعد دیکھیے تو وہ بالکل دوسری تصویر پیش کر رہا ہوگا۔ اب وہ اپنے موٹے تنہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اب جھکنے کا لفظ اس کی ڈکشنری سے خارج ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ ہواؤں کے جھونکے سے غیر متاثر رہ کر سیدھا اپنی جڑوں پر کھڑا رہتا ہے۔ اب وہ زمین پر ''درخت'' بن کر رہتا ہے، جب کہ اس سے پہلے وہ ''پودا'' بن کر رہ رہا تھا۔

درخت اس طرح تمثیل کی زبان میں بتا رہا ہے کہ ہر آدمی پر ابتداء وہ وقت آتا ہے جب کہ اس کو ایک وقفۂ تعمیر درکار ہوتا ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی جڑیں زمین میں داخل کرے۔ وہ اپنے تنہ کو مضبوط کرے۔ وہ اپنے آپ کو ایک طاقت ور وجود کی حیثیت سے نشوونما دے۔ اس وقفے کے دوران اس کو اس طرح نہیں رہنا چاہیے جس طرح کوئی شخص مضبوط اور مستحکم ہونے کے بعد رہتا ہے۔

اس ابتدائی مرحلہ میں اس کو نرمی اور موافقت (adjustment) کا مجسّمہ بن جانا چاہیے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کی تعمیر کا وقفہ نہیں ملے گا، اور جو کوئی وقفۂ تعمیر سے محروم ہو جائے، وہ کبھی مرحلۂ تعمیر تک بھی نہیں پہنچے گا۔ ایسا شخص ہمیشہ کمزور پودا بنا رہے گا، وہ کبھی تناور درخت کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

اسلامی دعوت

جب بارش کا موسم آتا ہے اور ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ کالے بادل فضا میں منڈلانا شروع کرتے ہیں تو خدا کا فرشتہ خاموش زبان میں یہ اعلان کرتا ہے کہ کون ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تا کہ خدا سارے کائناتی نظام کو اس کی موافقت میں جمع کر دے اور اس کے بعد اس کے بیج کو سات سو گنا زیادہ فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ آج دین کا بھی ہے۔ خدا نے آج سارے اسباب دین کی موافقت پر جمع کر دیے ہیں۔ سینکڑوں برس کی گردش کے بعد زمانہ نے فیصلہ کی جو بنیاد فراہم کی ہے وہ عین ہمارے حق میں ہے۔ اب ان امکانات کو بروئے کار لانے کے لیے ضرورت ہے کہ کچھ خدا کے بندے اٹھیں جو صرف خدا کے لیے اپنے آپ کو اس مشن میں دے دیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس مشن کے حوالے کریں گے ان کے لیے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ ان کے عمل کا سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ انعام آخرت میں لوٹائے گا اور اسی کے ساتھ اگر اس نے چاہا تو موجودہ دنیا میں بھی۔

اسلامی تاریخ دو بڑے مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب اس کے تیسرے مرحلہ کا آغاز ہونا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو اس تیسرے مرحلہ کو شروع کرنے کی سعادت حاصل ہوگی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ آج اس سے بڑا کوئی کام نہیں۔ آج اس سے بڑا کوئی میدان عمل نہیں جس میں قوت والے اپنی قوت لگائیں اور اس سے بڑی کوئی مد نہیں جس میں پیسہ والے اپنا پیسہ خرچ کریں۔

اسلام کیا ہے

اسلام ایک لفظ میں توحید کا نام ہے۔جس طرح درخت اصلاً ایک بیج کا نام ہوتا ہے اسی طرح اسلام کی اصل حقیقت توحید ہے اور بقیہ تمام چیزیں اسی توحید کے مظاہر اور تقاضے۔توحید بظاہر یہ ہے کہ خدا کئی نہیں ہیں بلکہ خدا ایک ہے۔مگر یہ توحید کوئی خشک گنتی کا عقیدہ نہیں ہے جو کچھ مقرر الفاظ دہرا کر آدمی کو حاصل ہو جائے۔ یہ اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر خدا کا اثبات ہے، یہ خدا کے مقابلے میں اپنے آپ کو دریافت کرنا ہے۔خدا قادر مطلق ہے اور بندہ عاجز مطلق۔ کوئی بندہ جب خدا کے ساتھ اپنی اس نسبت کو پالیتا ہے تو اسی کا نام توحید ہے۔توحید یا ایک اللہ پر ایمان ایک شعوری فیصلہ ہے۔ یہ حق کا انکار کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے حق کو مان لینا ہے۔ اس اعتبار سے ایمان حقیقتِ واقعہ کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔اور حقیقت واقعہ کا شعوری اعتراف بلاشبہ اس دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔

یہی توحید دنیا کی تمام چیزوں کا دین ہے۔زمین اور سورج انتہائی کامل صورت میں خدا کی تابعداری کر رہے ہیں۔شہد کی مکھی کمال درجہ پابندی کے ساتھ خدا کی مقرر کی ہوئی راہوں پر چل رہی ہے۔مگر ان میں سے کسی کی محکومی شعوری محکومی نہیں۔ وہ خود اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں جیسا کہ انہیں ہونا چاہیے۔ ساری کائنات میں یہ صرف انسان ہے جو ارادہ اور شعور کے ساتھ اپنے کو محکوم بناتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کامل طور پر خدا کی فرماں برداری کر رہی ہے۔مگر انسان کی فرماں برداری اختیاری ہے اور دوسری چیزوں کی فرمانبرداری بے اختیاری۔قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمین وآسمان کی تمام چیزیں خدا کو سجدہ کر رہی ہیں۔مگر ایک انسان جب سجدہ کرتے ہوئے زمین پر اپنا سر رکھتا ہے تو یہ تمام عالم کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ دوسری چیزیں مجبورانہ سجدہ کر رہی ہیں مگر انسان شعور اور ارادے کے تحت اپنا سر خدا کے آگے جھکا دیتا ہے۔

انسان کے ذریعہ اس کائنات میں شعوری اور اختیاری محکومی کا واقعہ وجود میں آتا ہے جس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے جو اس کائنات میں شعور قدرت کے مقابلہ میں شعور عجز کی دوسری انتہا بناتا ہے۔ وہ کائنات کے صفحہ پر "عدد" کے مقابلہ میں "صفر" کا ہندسہ تحریر کرتا ہے۔ وہ خداوندی انا کے مقابلہ میں اپنے بے انا (egoless) ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک شخص کا موحد بننا اس آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے جس کا انعام کوئی سب سے بڑی چیز ہی ہوسکتی ہے۔ اسی سب بڑی چیز کا نام جنّت ہے۔ جنّت کسی کے عمل کی قیمت نہیں۔ جنّت کسی بندے کے لیے خدا کی یہ بخشش ہے کہ اس کے بندے نے اپنے رب کو وہ چیز پیش کردی جو کائنات میں کسی نے پیش نہ کی تھی۔ اس لیے خدا نے بھی اس کو وہ چیز دے دی جو اس نے کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا تھا۔

جنّت کیا ہے

جنّت ایک انتہائی حیرت انگیز دنیا ہے جو خدا نے اپنے خاص بندوں کے لیے بنائی ہے۔ وہاں خدا کی صفات کمال اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جنت کے بارے میں قرآن میں ہے کہ وہاں نہ حزن ہوگا اور نہ خوف۔ یہ ناقابل قیاس حد تک انوکھی صفت ہے۔ کیوں کہ دنیا میں ہم جانتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا دولت مند یا حکمراں اس پر قادر نہیں کہ وہ غموں اور اندیشوں سے خالی زندگی اپنے لیے حاصل کرلے۔ جنت کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہاں ہر طرف "سلام سلام" کا چرچا ہوگا (56:26)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسے بلند انسانوں کی آبادی ہے جو ہر قسم کی منفی جذبات سے خالی ہوں گے۔ ان کے دلوں میں دوسروں کے لیے سلامتی اور خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ جنت کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وہاں آدمی جو غذا کھائے گا اور جو مشروبات پیئے گا وہ بول و براز کی شکل

میں نہیں خارج ہوگا بلکہ ایک خوشبودار ہوا نکلے گی اور اس کے ذریعہ تمام کثافت خارج ہو جائے گی۔(صحیح مسلم، حدیث نمبر 2835) اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسا لطیف مقام ہے جہاں غلاظت بھی بہ شکل خوشبو خارج ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت میں نیند نہیں ہوگی ۔(المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 8816) جب کہ وہاں آدمی کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔(فصلت، 41:31) اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت اتنی لذیذ جگہ ہے کہ آدمی ایک رات کی نیند کے بقدر بھی اس سے جدا ہونا پسند نہ کرے گا حالاں کہ وہ اس کے اندر کھرب ہا کھرب سال سے بھی زیادہ مدت تک رہے گا۔ کیسا عجیب ہوگا جنت کا پڑوس اور کیسی عجیب ہوگی جنت کی زندگی۔ پھر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جنت وہ مقام ہے جہاں آدمی اپنے خدا کو دیکھ سکے گا۔(القیامۃ، 75:23) وہ خدا جو ہر قسم کی ناقابل قیاس خوبیوں کا مالک ہے۔ وہ خدا جس نے عدم سے وجود کو پیدا کیا۔ وہ خدا جو آسمان کی عظمتوں کا خالق ہے۔ وہ خدا جس نے سورج کو چمکایا۔ وہ خدا جو درختوں کی سرسبزی اور پھولوں کی مہک میں ظاہر ہوا۔ ایسا خدا کیسا عظیم اور کیسا حسین ہوگا اس کا تصوراتی قیاس بھی کسی کے لیے ممکن نہیں۔ جس جنت میں ایسا نفیس ماحول ہو، جہاں کائنات کے رب کا دیدار حاصل ہوتا ہو اس کی لذتوں اور راحتوں کو کون بیان کرسکتا ہے۔

مومنانہ زندگی

ایسی قیمتی جنت کسی کو سستے داموں نہیں مل سکتی۔ یہ اسی خوش نصیب روح کا حصہ ہے جو حقیقی معنوں میں خدا کا مومن بندہ ہونے کا ثبوت دے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی عام دنیادارانہ زندگی کے ساتھ کچھ اسلامی عملیات کا جوڑ لگا لے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہی آدمی کی پوری زندگی بن جائے۔ اسلام ہاتھ کی چھنگلیا نہیں بلکہ وہ آدمی کا پورا ہاتھ ہے۔ جو شخص اسلام کو اپنی زندگی میں غیر مؤثر ضمیمہ بنا کر رکھے اس نے اسلام

کی توہین کی۔ اسی طرح مومن ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آدمی "خدائی فوجدار" بن کر کھڑا ہو جائے اور حکمرانوں کے خلاف اپوزیشن کا پارٹ ادا کرنے کو اسلام کا کمال سمجھنے لگے۔ اس قسم کی چیزیں اسلام نہیں، وہ خود ساختہ سیاست کو اسلام کا نام دینا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ اگر دین کی کم قدری کے مجرم ہیں تو دوسری قسم کے لوگ دین کی تحریف کے۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں آدمی کو خدا کی ناراضگی کا مستحق بناتی ہیں، نہ کہ خدا کے انعام کا۔

مومن وہ ہے جس کے سینے میں اسلام ایک نفسیاتی طوفان بن کر داخل ہوا ہو۔ جو خدا کو اتنا قریب پائے کہ اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہو جائیں۔ جس کی تنہائیاں خدا کے فرشتوں سے آباد رہتی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کی زبان میں خدا کی لگام دے رکھی ہو۔ اور جس کے ہاتھوں اور پیروں میں خدا کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کو حشر کی آمد سے پہلے حشر کے میدان میں کھڑا کر دیا ہو، حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر مرنے کے بعد گزرنے والا ہے وہ مومن پر جیتے جی اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔ دوسرے لوگ جن باتوں کو اس وقت پائیں گے جب کہ خدا غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا، مومن ان باتوں کو اس وقت پالیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب کے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔ مومن پر قیامت سے پہلے قیامت گزر جاتی ہے جب کہ دوسروں پر قیامت اس وقت گزرے گی جب کہ وہ عملاً آچکی ہوگی۔

اسلامی دعوت

آگ کا انگارہ جب خارج کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے تو اسی کو ہم آنچ کہتے ہیں۔ برف کا تودہ جب اپنے ماحول کو اپنی حقیقت سے متعارف کرتا ہے تو اسی کو ٹھنڈک کہا جاتا ہے۔ یہی معاملہ مومن کا بھی ہے۔ زمین پر کسی مومن کا وجود میں آنا خود ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اسلامی دعوت ضرور وجود میں آئے گی۔ کسی نفس انسانی میں جب وہ خدائی بھونچال آتا ہے جس کو اسلام کہا گیا ہے تو اس کے بعد لازمی نتیجے کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے باہر

کی دنیا اس سے باخبر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہی اسلامی دعوت کا آغاز ہے۔

اسلامی دعوت فرد انسانی میں انقلاب لانے کی دعوت ہے، نہ کہ کسی قسم کے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ میں اکھیڑ پچھاڑ کرنے کی۔ اسلامی انقلاب اصلاً ایک نفسیاتی انقلاب ہے اور نفسیاتی انقلاب کسی نفس ہی کے اندر وقوع میں آسکتا ہے۔ نفس کا وجود صرف ایک فرد میں ہوتا ہے اس لیے اسلام کی گھٹنا بھی ایک فرد ہی میں گھٹتی ہے۔ قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کا اپنا کوئی نفسیاتی وجود نہیں۔ اس لیے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے خالی فضا میں تیر مارنا۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے قومی حالات یا کسی جغرافیہ کے تمدنی احوال لوگوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کے درمیان ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے اندر ان کے قومی یا سیاسی حالات کے نتیجے میں کوئی حرکت اٹھ کھڑی ہو تو اس کا نام اسلامی تحریک نہیں ہو جائے گا۔ اگر مسلمان اپنے قومی دشمن سے تصادم کو جہاد کہیں یا اپنی قومی تعمیر کو اسلامی نظام کی اصطلاحوں میں بیان کریں تو یہ اسلام نہیں بلکہ غیر اسلام کو اسلام کا نام دینا ہے، جو آدمی کو صرف سزا کا مستحق بناتا ہے، نہ یہ کہ اس کی بنا پر آدمی کو کوئی اسلامی انعام دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں اس قسم کی اسلامی تحریکیں عظیم الشان پیمانے پر اٹھیں مگر عملاً وہ اس طرح بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں جیسے خدا کے نزدیک ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کے سب قومی ہنگامے ہیں اور کسی قوم کے قومی ہنگاموں کا نام اسلام نہیں۔ اسلامی دعوت کی تحریک ایک لفظ میں جنت کی طرف بلانے کی تحریک ہے۔ جنت خدا کی لطیف و نفیس دنیا ہے جہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جو اخلاق خداوندی کی سطح پر جئے ہوں، جنہوں نے دنیوی تعلقات میں کمال انسانیت کا ثبوت دیا ہو، جو خدا کی ابدی دنیا سے اثر لے کر متحرک ہوئے ہوں، نہ کہ سیاسی اور معاشی حالات کے اثر سے۔ آج

کی دنیا میں اسی کا چناؤ ہورہا ہے۔ جولوگ اپنی نفسیات اور کردار کے اعتبار سے جنتی ماحول میں بسانے کے قابل ٹھہریں گے ان کو چھانٹ کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد بقیہ تمام لوگ خدا کی رحمتوں سے محروم کر کے دور پھینک دیے جائیں گے تا کہ ابدی طور پر تاریکیوں کے غار میں بھٹکتے رہیں۔

انسان کے سوا بقیہ دنیا بے حد حسین ہے۔ ہرے بھرے درختوں اور نرم و نازک پھولوں کو دیکھیے ،زمین و آسمان کے قدرتی مناظر کا معائنہ کیجیے۔ ان کی بے پناہ کشش آپ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے گی کہ ان سے نظر ہٹانے کا جی نہ چاہے گا۔ مگر اس کے مقابلہ میں انسانی دنیا ظلم اور گندگی کا کوڑا خانہ بنی ہوئی ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی سطح پر خدا کی مرضی براہ راست اپنی پوری شکل میں نافذ ہے، یہ دنیا ویسی ہی ہے جیسا کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ ہو۔ اس کے برعکس، انسان کو خدا نے آزادی دے دی ہے۔ اسی آزادی کے غلط استعمال نے انسانی دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام خوبیوں کا مالک صرف خدا ہے۔ خدا جہاں اپنے اختیار کو روک لے وہیں سے جہنم شروع ہوجاتی ہے اور خدا جب اپنے اختیار کو نافذ کر دے تو اسی کا نام جنت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا کہ انسان کو آزادی دے دی کہ وہ خدا کی حسین دنیا کو اپنی باغیانہ کارروائیوں سے عذاب خانہ بنا دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر وہ قیمتی انسان چنے نہیں جا سکتے تھے جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ خدا کی وسیع دنیا اپنی ان گنت چیزوں کے ساتھ مکمل طور پر خدا کی اطاعت گزار ہے۔ حقیر چیونٹی سے لے کر عظیم کہکشانی نظاموں تک کوئی چیز بھی نہیں جو خدا کی مرضی سے ادنیٰ انحراف کرتی ہو۔ تاہم یہ تمام چیزیں اس لیے محکوم ہیں کہ وہ بے اختیار ہیں۔ فرماں برداری کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔ اب خدا کو ایسی باشعور اور حقیقت پسند

مخلوق درکار تھی جو اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جائے۔ جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو خدا کا محکوم بنا لے۔ یہی وہ انتہائی نادر ہستیاں ہیں جن کو چھانٹنے کے لیے خدا کا یہ عظیم کارخانہ آباد کیا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک انسانی ذہن کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی رہی ہے وہ انسان کی دنیا میں خرابی کا مسئلہ (problem of evil) ہے۔ ایک مفکر کے الفاظ میں ساری انسانی تاریخ ظلم اور برائی کا رجسٹر معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنی آزادی کا انتہائی ظالمانہ استعمال کرتا ہے۔ مگر اتنی بڑی برائی کو خدا نے صرف اس لیے گوارا کیا کہ اس کے بغیر اس اعلیٰ نوع کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا تھا جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ اختیار اور آزادی کے ماحول ہی میں وہ انسان چنے جا سکتے ہیں جن کے متعلق خدا کے نگراں فرشتے یہ گواہی دیں کہ یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے مکمل اختیار رکھتے ہوئے اپنے کو خدا کی خاطر بے اختیار کر لیا تھا۔ دنیا کی بے پناہ برائیاں دراصل ایک بے پناہ بھلائی کی قیمت ہیں۔ یہ بھلائی کہ انسانوں کے جنگل سے وہ سعید روحیں چھان کر نکالی جائیں جو پورے شعور اور مکمل ارادے کے ساتھ اپنے کو خدا کا محکوم بنالیں۔ جو محض حقیقت پسندی کی بنا پر خدا کی محکومی اختیار کریں، نہ کہ مجبوری کی بنا پر۔

یہ وہ انوکھی ہستیاں ہیں جن کو یہ موقع تھا کہ وہ حق کو جھٹلا دیں مگر انہوں نے حق کو نہیں جھٹلایا۔ جن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی انا کا جھنڈا اونچا کریں۔ مگر وہ اپنے کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خدا کو صدر نشین بنانے پر راضی ہو گئے۔ جن کو پوری طرح یہ آزادی ملی ہوئی تھی کہ وہ اپنی قیادت اور اپنے مفادات کا گنبد کھڑا کریں مگر انہوں نے ہر "اپنے" کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا دیا اور صرف حق کا گنبد کھڑا کر کے انہوں نے خوشی حاصل کی۔ اس قسم کی نادر روحیں اس کے بغیر چنی نہیں جا سکتی تھیں کہ ان کو مکمل آزادی کے ماحول میں رکھا جائے اور آزادی

کا حقیقی ماحول قائم کرنے کی ہر قیمت برداشت کی جائے۔ اسلامی دعوت کا مقصد ایسی ہی روحوں کو تلاش کرنا ہے۔

اسلامی انقلاب

دنیا میں سیاسی اور تمدنی انقلاب اسلامی دعوت کا براہ راست نشانہ نہیں۔ تاہم وہ اس کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ کسی معاشرہ میں جب قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی جمع ہو جائے جو اللہ کے لیے جینا اور اللہ کے لیے مرنا چاہتے ہوں تو قدرتی طور پر وقت کی سیاست اور تمدن پر انہیں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی سیاست یا اسلامی نظام نام ہے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کا جو اللہ کے آگے اپنے کو بے نفس کر چکے ہوں۔ جنہوں نے اپنی "میں" کو خدا کے عظیم تر "میں" میں گم کر دیا ہو۔ جن کے جذبات و احساسات آخرت سے اتنا زیادہ متعلق ہو جائیں کہ دنیا میں ان کا کوئی حوصلہ باقی نہ رہے جو دوسرے کے دل کے درد کو اپنے سینے میں محسوس کرتے ہوں۔ ایسے ہی افراد اسلامی نظام قائم کرتے ہیں اور ایسے افراد اسی وقت بنتے ہیں جب کہ ہر قسم کے دنیوی مقصد سے بلند ہو کر خالص آخرت کے لیے تحریک چلائی جائے۔ اس کے برعکس اگر نعروں اور جلسوں کے زور پر کوئی انقلاب برپا کیا جائے تو وہ انقلاب نہیں ایک ہڑبونگ ہوگا جہاں اسلام کے نعرے تو بہت ہوں گے مگر اسلام کے عمل کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ ایسے لوگ حق کے تقاضوں کا نام لیں گے مگر عملاً اپنے گروہ کے تقاضوں کے سوا کوئی چیز ان کے سامنے نہ ہوگی۔ وہ انقلاب اسلامی کے ہنگامے برپا کریں گے حقیقتاً ان کا مدعا یہ ہوگا کہ دوسروں کو تخت سے ہٹا کر خود اس پر قابض ہو جائیں۔ وہ انسانیت اور اخلاق کے نام پر جلسوں اور تقریروں کی دھوم مچائیں گے مگر اس کا مقصود صرف یہ ہوگا کہ ایک خوبصورت عنوان پر اپنی قیادت کی شان قائم کریں۔ اسلامی انقلاب کی واحد لازمی شرط "بے میں" انسانوں کی فراہمی ہے اور موجودہ طرز کی تحریکوں سے سب سے کم جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ یہی ہے۔ بلکہ

سیاسی اورقومی انداز کی یہ تحریکیں تو "میں" کی غذا ہیں، نہ کہ "میں" کی نفسیات کو ختم کرنے والی — خارجی انقلاب کو نشانہ بنانے والی تحریک افراد کے اندر کردار نہیں پیدا کرسکتی۔ کردار ہمیشہ ذاتی محرک سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ خارجی محرک سے۔ کوئی آدمی دوسرے کے لیے نہیں کماتا، اسی طرح کوئی آدمی بیرونی محرّک کے لیے با کردار بھی نہیں بنتا۔ جو لوگ "نظام" کے نام پر افراد سے با کردار بننے کی اپیلیں کرتے ہیں وہ صرف اپنی سطحیت کا ثبوت دیتے ہیں اور دوسرے کے بارے میں کمتر اندازے کا۔

پیغمبر کا کام

اسلام کا مشن ایک ہی مشن ہے۔ اور وہ ہے توحید کا پیغام لوگوں تک پہنچانا۔ ایک ایک شخص کو موحّد بنانے کی کوشش کرنا۔ یہی قدیم ترین زمانہ سے تمام نبیوں کا مشن تھا۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام زمانوں میں توحید کی دعوت جان کی قربانی کی قیمت پر دینی ہوتی تھی۔ توحید کا پیغام لے کر اٹھنے والے آگ کے الاؤ میں ڈال دیے جاتے اور آروں سے چیر دیے جاتے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانے میں شرک کو فکری غلبے کا مقام حاصل تھا۔ حتیٰ کہ سیاست کی بنیاد بھی شرک پر قائم تھی۔ قدیم زمانے کے بادشاہ، لوگوں کو یہ باور کرا کے ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ ان کے اندر خدا حلول کر آیا ہے۔ اس لیے جب توحید کا داعی یہ آواز بلند کرتا کہ خدا صرف ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، تو قدیم زمانے کے بادشاہوں کو یہ آواز براہ راست ان کے حق حکمرانی کو چیلنج کرنے والی نظر آتی تھی۔ اس میں انہیں اپنی مشرکانہ سیاست کی تردید دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے سیاسی مفاد کی بنا پر توحید کے داعیوں کے دشمن بن جاتے اور بے رحمی کے ساتھ ان کو کچل دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس صورتِ حال کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ قرآن

میں پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کو سکھایا گیا کہ تم اس طرح دعا کرو:

رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ إِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِنَا۔ (2:286) خدایا ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے کے لوگوں پر ڈالا تھا۔ یہ دعا کے انداز میں اس خدائی فیصلہ کا اظہار تھا کہ خدا انسانی تاریخ میں ایک نیا انقلاب لانے والا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقتدار کا رشتہ شرک سے ٹوٹ جائے گا۔ اب حکومت ایک خالص سیاسی معاملہ ہوگا، نہ کہ اعتقادی معاملہ یہی وہ خدائی منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے لیے قرآن میں حکم دیا گیا: وَقَاتِلُوهُمۡ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتۡنَةٌ وَيَكُونَ ٱلدِّينُ كُلُّهُۥ لِلَّهِ۔ (8:39) یعنی مشرکوں سے لڑو یہاں تک کہ فتنے کی حالت باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کا ہو جائے۔

فتنہ کے معنی آزمائش کے ہیں۔ فَتَنَ فُلاناً عَن رَايِه کے معنی ہیں رائے سے پھیر دینا۔ قرآن میں آیا ہے: موسیٰ کو اس کی قوم میں چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون اور اپنی قوم کے بڑے لوگوں کے ڈر سے جن کو اندیشہ تھا کہ فرعون ان کو ستائے گا۔ (10:83) اس آیت میں أن يَفۡتِنَهُمۡ کا لفظ ہے جو ستانے اور عذاب دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ گویا فتنہ کے معنی تقریباً وہی ہیں جس کو انگریزی زبان میں (persecution) کہتے ہیں۔ یعنی کوئی رائے یا عقیدہ رکھنے کی بنا پر کسی کو ستانا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا فتنہ تھا جس کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ شرک کا فتنہ تھا۔ چنانچہ مفسرین نے ان آیات میں فتنہ کی تفسیر "شرک" سے کی ہے۔ تاہم یہاں فتنہ سے مراد مطلق شرک نہیں بلکہ شرکِ جارح ہے۔ کیوں کہ شرک جب جارح ہو تبھی وہ روکنے والا بنتا ہے۔ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتۡنَةٌ کا مطلب ہے حتىٰ لَا يُفۡتَنَ رَجُلٌ عَنۡ دِينِهِ۔ یعنی شرک جارح سے لڑ کر اسے ختم کر دو تا کہ دینِ شرک بے زور اور مغلوب ہو کر رہ جائے اور غالب دین کی حیثیت سے صرف دینِ توحید دنیا میں باقی رہے۔

شرک اپنی ابتدائی صورت میں محض ایک عقیدہ ہے۔ مگر قدیم زمانے میں اس نے "فتنہ" کا مقام حاصل کرلیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانے میں انسانی فکر پر شرک کا غلبہ تھا۔ زندگی کے ہر معاملے کو شرک کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ سیاست وحکومت کی بنیاد بھی شرک کے اوپر قائم تھی۔ لوگ سورج اور چاند جیسی چیزوں کو دیوتا سمجھتے تھے اور شاہی خاندان اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کی اولاد بتا کر لوگوں کے اوپر حکومت کرتا تھا۔ اس بنا پر جب توحید کا داعی یہ کہتا کہ خدا صرف ایک ہے، باقی تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو قدیم بادشاہوں کو یہ نظریہ ان کے حق حکمرانی کی تردید کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ اس کو اپنا حریف سمجھ کر اس کو مٹانے کے درپے ہوجاتے۔ عرب میں اور اطراف عرب میں توحید کی بنیاد پر جو اسلامی انقلاب آیا اس نے شرک کو فکری غلبے کے مقام سے ہٹا دیا۔ اب شرک کی حیثیت ایک ذاتی عقیدہ کی ہوگئی، نہ کہ ایک ایسے عوامی نظریہ کی جس کے اوپر سماجی زندگی کا پورا نظام قائم ہو۔ نتیجتاً شرک کا رشتہ اقتدار سے ٹوٹ گیا۔ کیوں کہ اب شرک کی بنیاد پر کسی کے لیے حقِ حکمرانی کا دعویٰ کرنے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔

معلوم انسانی تاریخ میں یہ تبدیلی بالکل پہلی بار آئی۔ اس کے ہمہ گیر اثرات میں سے دو چیزیں یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ جب یہ معلوم ہوا کہ خدا صرف ایک ہے اور بقیہ تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر مظاہر فطرت کے تقدس کا ذہن ختم ہوگیا۔ وہ چیزیں جو اب تک انسان کے لیے پرستش کا عنوان بنی ہوئی تھیں۔ وہ اس کو اپنی خادم نظر آنے لگیں: هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (2:29) اب آدمی نے چاہا کہ وہ ان چیزوں کو جانے اور ان کو استعمال کرے۔ انسانی ذہن کی یہی وہ تبدیلی ہے جس نے تاریخ میں توہماتی دور کو ختم کرکے سائنس کے دور کو شروع کیا۔ اسی کے ساتھ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت کا دور کم از کم نظریاتی طور پر ختم ہوگیا اور عوامی

حکمرانی کے دور کا آغاز ہوا۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ تمام انسان یکساں ہیں، کسی انسان کے اندر کوئی خدائی صفت نہیں تو اس کے بعد بالکل قدرتی طور پر خدائی حقِّ حکمرانی کے لیے زمین باقی نہیں رہی۔

ان دونوں انقلابات کا آغاز مدینہ سے ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ دمشق، بغداد، اسپین اور سسلی ہوتا ہوا قدیم آباد دنیا کے بڑے حصے میں پھیل گیا۔ اس مدت میں قدیم حالات کے اثر سے اس فکری تحریک کو بار بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اس کا سفر جاری رہا۔ مخالف طاقتوں کی کوئی بھی کوشش اس میں کامیاب نہ ہو سکی کہ وہ مظاہر فطرت کے تقدّس کے دور کو دوبارہ اس کی سابقہ عظمت کے ساتھ واپس لا سکے۔ اور نہ کسی حکمراں کے لیے کبھی یہ ممکن ہوا کہ وہ اس طرح مقدّس بادشاہ ہونے کا مقام حاصل کر لے جیسا کہ عراق کے نمرود اور مصر کے فرعون کو قدیم زمانے میں حاصل تھا۔

مسلم دنیا سے مغربی دنیا کی طرف

ابتداءً تقریباً ایک ہزار سال تک یہ عمل مسلم دنیا میں ہوتا رہا۔ مگر سولھویں صدی عیسوی میں ایک نیا انقلاب آیا۔ مسلمانوں کے آپس کے اختلاف کی وجہ سے ایک طرف بغداد کی عباسی خلافت ٹوٹ گئی اور دوسری طرف اسی باہمی اختلافات کے نتیجے میں اسپین کا مسلم اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مسلم دنیا میں کوئی ادارہ ان لوگوں کی سرپرستی کرنے والا نہ رہا جو علمی وفکری تحقیق کا کام کر رہے تھے۔ چنانچہ علماء اور مفکرین کی بڑی تعداد دھیرے دھیرے اٹلی اور فرانس کی طرف منتقل ہو گئی۔ مخصوص اسباب کی بنا پر یورپ میں ان لوگوں کو بہت پذیرائی ملی۔ انقلابی عمل جو اس سے پہلے مسلم دنیا میں ہو رہا تھا، وہ یورپ کی دنیا میں ہونے لگا۔ تاہم یورپ پہنچ کر اس کے اندر ایک تبدیلی آ گئی۔ مسلم دنیا میں یہ کام اسلام کے زیر اثر ہو رہا تھا، یورپ کو اسلام سے دلچسپی نہ تھی، اس نے اس کو اسلام سے جدا کر کے خالص علمی حیثیت سے

فروغ دینا شروع کیا۔ اگرچہ مسلم علوم اور عربی زبان کی اس منتقلی کا اثر یورپ کے مسیحی عقائد پر بھی پڑا۔ حتیٰ کہ مارٹن لوتھر (1546-1483) براہ راست طور پر یورپ کے اوپر اسلامی اثرات کی پیداوار تھا۔ تاہم علمی وفکری تحریک کا ارتقاء یورپ میں آزاد سیکولر شعبہ کے طور پر ہوا، نہ کہ مذہب کے ایک ذیلی شعبہ کے طور پر، جدید مغرب کا سائنسی اور جمہوری انقلاب تمام تر اسلامی انقلاب کی دین ہے۔ البتہ مغرب نے اس کو مذہب سے جدا کر کے سیکولر شکل دے دی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید مغربی انقلاب، اسلامی انقلاب کی ایک دنیوی صورت ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ایٹم بم آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی فوجی صورت ہے اور قومی ملکیت مارکسی نظریہ کی معاشی صورت۔

جدید انقلاب کی اسلامی اہمیت

جدید مغربی انقلاب، اپنی عمومی حیثیت میں، خود اسلام کا پیدا کردہ تھا۔ اس کے نتائج اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم تھے۔ اس انقلاب نے دنیوی اعتبار سے اس دعا کی تکمیل کر دی تھی جس کو خدا نے ان الفاظ میں ہمیں تلقین کیا تھا: اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلے لوگوں پر ڈالا (البقرہ، 2:862) اس انقلاب کے نتیجے میں زندگی کے نظام میں ہمارے موافق جو تبدیلیاں ہوئیں وہ خاص طور پر یہ تھیں:

1۔ قدیم زمانے کے بادشاہ لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھا کر حکومت کرتے تھے کہ وہ سورج دیوتا یا چاند دیوتا کی اولاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں توحید کی دعوت فوراً سیاسی اقتدار کی حریف بن جاتی تھی اور مشرک بادشاہوں کے ظلم کا نشانہ بنتی تھی۔ شرک کی تردید کو وہ اپنے حقِّ حکمرانی کی تردید کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ اسلامی انقلاب کی تکمیل کے طور پر یورپ میں جو جمہوری انقلاب آیا ہے اس نے اس نزاکت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ کیوں کہ آج کا حکمراں عوامی رائے سے حکمرانی کا حق حاصل کرتا ہے، نہ کہ خدا کے ساتھ اپنا مفروضہ اُلوہی

رشتہ جوڑ کر۔ اس تبدیلی نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان کھول دیا کہ توحید کی تبلیغ اس اندیشے کے بغیر کی جائے کہ پہلے ہی مرحلہ میں غیر ضروری طور پر اس کا ٹکراؤ سیاسی ادارہ سے ہو جائے اور وہ اس کو کچل کر رکھ دے، جیسا کہ اسلام سے پہلے ساری تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔

2۔ قدیم زمانے میں مظاہر فطرت (سورج، چاند، دریا وغیرہ) کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ توحید کی بنیاد پر ہونے والے اسلامی انقلاب اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والے مغرب کے سائنسی انقلاب کے بعد یہ ہوا کہ فطرت کے واقعات خدائی مظاہر کے بجائے عام مادی مظاہر سمجھے جانے لگے۔ جو چیز پہلے پوجنے کی چیز سمجھی جاتی تھی وہ اب تحقیق و تجسس کی چیز بن گئی۔ اس کے نتیجے میں جدید سائنسی اور تکنیکی انقلاب پیدا ہوا جس نے بے شمار نئی طاقتیں انسان کے قبضہ میں دے دیں۔ اس انقلاب کے ذریعہ تیز رفتار سواریاں وجود میں آئیں اور جدید ذرائع ابلاغ (پریس، ریڈیو وغیرہ) تک انسان کی دسترس ہوئی۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہو گیا کہ کسی عقیدہ کی تبلیغ عالمی اور بین اقوامی سطح پر کی جا سکے۔ خدا کے دین کی دعوت مقامی دعوت کے مرحلے سے گزر کر عالمی دعوت کے مرحلے میں داخل ہو گئی۔

3۔ اس انقلاب کے ذریعہ کائنات کے وہ چھپے ہوئے حقائق سامنے آئے جو توحید اور اس سے متعلق نظریات کے حق میں اعلیٰ علمی دلائل فراہم کر رہے ہیں۔ جنہوں نے قرآن کے کائناتی اشاروں کو کھول کر ہر ایک کے لیے انہیں قابل فہم بنا دیا ہے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار وہ دور آیا جب کہ کائناتی نشانیاں معجزہ کا بدل بن جائیں۔ دینی حقیقتوں کو مشاہداتی دلائل کی سطح پر ثابت کیا جا سکے۔

4۔ پھر اسی انقلاب کے ذریعہ تاریخ میں پہلی بار معاملات پر غور و فکر کا سائنسی، بالفاظ دیگر، واقعاتی نقطۂ نظر پیدا ہوا۔ کائنات کا علم صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب کہ انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں اس پر غور کیا جائے۔ اس لیے اس کے اثر سے علمی دنیا میں یہی عام

ذہن بن گیا۔ اب واقعات کو واقعات کی رو سے دیکھا جانے لگا، نہ کہ خوش عقیدگی یا توہمات کے اعتبار سے۔ اب یہ فضا پیدا ہوئی کہ مذاہب کی خالص علمی اور تاریخی تحقیق کی جائے۔ اسی اندازِ مطالعہ کا یہ نتیجہ تھا کہ موجودہ زمانے میں علمی سطح پر یہ تسلیم کرلیا گیا کہ اسلام کے سوا جتنے مذاہب ہیں سب کے سب غیر تاریخی (اور اس بنا پر ناقابل اعتبار) ہیں۔ مذاہب کے درمیان جس مذہب کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل ہے وہ صرف اسلام ہے۔ (ملاحظہ ہو: دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس)

مغرب کا غلبہ مسلم دنیا پر

مسلم دنیا نے صلیبی جنگوں (1095-1271) میں مسیحی یورپ پر فتح پائی تھی۔ مگر اس فتح کے بعد ہی برعکس عمل بھی شروع ہو گیا۔ مسیحی یورپ نے محسوس کیا کہ اس کی شکست کا سبب علمی اور فکری میدان میں مسلم دنیا سے اس کا پیچھے ہونا تھا۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے بعد یورپ نے تیزی سے مسلمانوں کے علوم اور عربی زبان کو سیکھنا شروع کر دیا۔ بعد کی صدیوں میں جب مسلم دنیا کے اہلِ علم یورپ کے ملکوں میں منتقل ہوئے تو وہاں یہ عمل اور تیزی سے جاری ہو گیا۔ بالآخر مغرب کی ترقی اس نوبت کو پہنچی کہ وہ علم وعمل کے تمام شعبوں میں مسلم قوموں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس نے مسلم ممالک میں داخل ہونا شروع کیا اور انیسویں صدی تک یہ حال ہوا کہ تقریباً تمام مسلم دنیا پر مغربی قوموں کا تسلّط قائم ہو گیا۔

یہی سیاسی حادثہ اس بات کا سبب بن گیا کہ مذکورہ قیمتی امکانات اسلامی دعوت کے حق میں استعمال نہ ہوسکیں۔ صلیبی جنگوں میں ہاری ہوئی قوموں کو دوبارہ مسلم علاقوں میں گھستے ہوئے دیکھ کر لوگ بپھر اٹھے۔ ساری مسلم دنیا میں مغرب کے خلاف سیاسی زور آزمائی شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگ سیاسی مقابلہ آرائی ہی کو عین اسلام ثابت کرنے لگے تاکہ لوگ جب اجنبی حکمرانوں سے لڑ کر فارغ ہوں تو خود اپنے ملکی حکمرانوں کے خلاف مقدّس سیاسی جہاد

چھیڑ دیں۔ اس فضا میں کسی کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ جدید دنیا نے کچھ نئے امکانات کھولے ہیں اور وہ اسلام کے حق میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ جدید مواقع انتظار کرتے رہے کہ ہم ان کو استعمال کر کے اسلام کی دعوت کو سارے عالم میں پھیلا دیں اور نتیجتاً خدا کی نصرت کے مستحق ہوں۔ مگر ہماری سیاسی نفسیات نے ہم کو ادھر توجہ دینے کی فرصت ہی نہ دی۔

سیاسی انقلاب کی نوعیت

سیاسی انقلاب کی اہمیت اسلام میں کیا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے سیاسی انقلاب دراصل اس کا نام ہے کہ اہل حق کو اہل باطل پر غلبہ حاصل ہو جائے۔ (الصّف، 61:9) قرآن کی صراحت کے مطابق یہ غلبہ خدا کی توفیق اور نصرت سے حاصل ہوتا ہے: وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ (3:126) اور خدا کی نصرت کا استحقاق حاصل کرنے کی واحد لازمی شرط دعوت ہے۔ اہل حق جب دعوت کے عمل کو اس کی تمام صالح شرائط کے ساتھ شروع کریں اور اس کو کرتے ہوئے اتمام حجت کے قریب پہنچا دیں تو اس وقت اس دعوتی عمل کی تکمیل کے نتیجے میں ایک طرف اہل حق انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اہل باطل سزا کے مستحق۔ اس وقت خدائی منصوبے کے تحت حالات میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے۔ اہل حق خدائی طاقت سے مسلح ہو کر اہل باطل پر غالب آتے ہیں۔ دعوتِ حق اور اتمامِ حجّت کے بغیر محض سیاسی کارروائیوں سے کبھی کسی مسلم گروہ کو غیر مسلم طاقتوں پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا کی سنّت ہے اور خدا کی سنّت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (الانعام، 6:131)

غیر مسلم اقوام کے لیے غلبہ کا فیصلہ خدا کے عام قانونِ امتحان کے تحت ہوتا ہے۔ (یونس، 10:14) مگر اہل ایمان کے لیے غلبے کا فیصلہ قانونِ اتمامِ حجّت کے تحت ہوتا ہے۔ اگر ہم غیر مسلم گروہ پر دعوتی عمل کو انجام نہ دیں تو ہم کو یہ امید بھی نہ کرنی چاہیے کہ غیر مسلم

گروہ پر ہمیں غلبہ عطا کیا جائے گا۔ دعوتی عمل ہی تو غیر مسلم گروہ پر غلبہ کی قیمت ہے۔ پھر جب قیمت ادا نہ کی گئی ہو تو متاع مطلوب آخر کس طرح حاصل ہو گی۔

مسلم دنیا میں سیاسی ردّعمل

چودھویں صدی ہجری کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ انیسویں صدی عیسوی کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ اس اعتبار سے چودھویں صدی ہجری اسلامی تاریخ کی اہم ترین صدی تھی۔ کیوں کہ یہ اس وقت آئی جب کہ اسلامی انقلاب کے بعد شروع ہونے والا عمل اپنی آخری تکمیل کے مرحلے تک پہنچ گیا تھا۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جس عالمی ہدایت کا دروازہ کھولا تھا، اس کو بَرُوئے کار لانے کے حالات اور ضروری وسائل اپنی کامل صورت میں مہیا ہو کر ہمارے سامنے آچکے تھے۔ مگر تاریخ کا غالباً یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ یہ دروازہ عین اس وقت خود مسلمانوں کے ہاتھوں بند ہو گیا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں کھولا تھا۔

جدید انقلاب نے یورپ کو جو طاقتیں دی تھیں ان کو اس نے اسی طرح اپنے قومی عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جس طرح کوئی بھی قوم ان حالات میں کرتی ہے۔ مغربی قوموں کی دسترس جیسے ہی جدید طاقتوں پر ہوئی ان کے یہاں وہ چیز وجود میں آئی جس کو مغربی استعمار کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے جغرافیہ سے نکل کر خشکی اور تری میں اپنے جھنڈے گاڑے۔ قوموں کے درمیان اپنی تہذیب پھیلائی۔ جن لوگوں نے ان کے راستے میں رکاوٹ ڈالی ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ مغربی قوموں کے ان عزائم کا براہ راست شکار ہونے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ کیوں کہ اس وقت یورپ کے باہر اکثر آباد دنیا مسلمانوں ہی کے زیر اقتدار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چیز جس کو ہم نے اسلامی انقلاب کا سیکولر نتیجہ کہا ہے، اس کا تعارف مسلمانوں سے اپنے پہلے ہی مرحلہ میں اس حیثیت سے ہوا گویا کہ وہ ایک

دشمن طاقت ہے جومسلمانوں کو ان کی تمام عظمتوں سے محروم کرکے ان کو ایک مغلوب اور پسماندہ قوم بنادینا چاہتی ہے۔ مغربی انقلاب کاافادی پہلوان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، وہ اس کو اپنے سیاسی اقتصادی حریف کی حیثیت سے دیکھنے لگے۔

چودھویں صدی ہجری اسلام کی پوری تاریخ میں پہلی صدی تھی جب کہ یہ امکان پیدا ہوا تھا کہ اسلام کی دعوت توحید کو یُسر (آسانی) کے حالات میں انجام دیا جائے جب کہ اس سے پہلے صرف عُسر (سختی) کے حالات ہی میں اس کو انجام دینا ممکن ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی پہلی بار ہوا کہ خود انسان کے اپنے مسلمات کے مطابق اسلام کا دیگر ادیان کے مقابلے میں واحد معتبر دین ہونا ثابت کیا جائے اور اس کو اعلیٰ ترین علمی شواہد سے اس طرح مدلل کردیا جائے کہ کسی کے لیے انکار کی جرأت باقی نہ رہے۔ نیز اس صدی میں پہلی بار تیز رفتار سواریاں اور تبلیغ کے جدید ذرائع انسان کے قبضے میں آئے جن سے کام لے کر اسلام کے پیغام کو بین اقوامی سطح پر پھیلایا جا سکتا تھا۔ مگر جو قومیں ان خدائی برکتوں کو ہماری طرف لا رہی تھیں وہ اتفاقی حالات کے نتیجے میں ہماری سیاسی حریف بن گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری مسلم دنیا مغرب کے بارے میں مخالفانہ نفسیات کا شکار ہوگئی، مغرب کی طرف سے آنے والے انقلاب کاافادی پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ حالاں کہ خدا نے مسلمانوں کے لیے ایسا امکان کھولا تھا کہ وہ خود مغرب کے پیدا کردہ حالات کو اپنے دعوتی مقاصد میں استعمال کرکے مغرب کو نظریاتی طور پر فتح کرسکتے تھے۔ اگر مسلمانوں نے بروقت اس دانش مندی کا ثبوت دیا ہوتا تو چودھویں صدی ہجری میں وہ واقعہ دوبارہ نئے انداز سے پیش آتا جو آٹھویں صدی ہجری میں تاتاری فاتحین کے خادمان اسلام بن جانے کی صورت میں پیش آچکا ہے۔

موجودہ زمانے کی اسلامی تحریکیں

چودھویں صدی ہجری میں ساری مسلم دنیا میں بے شمار اسلامی تحریکیں اٹھیں۔ مگر ضمنی

فرق کے باوجود یہ تمام تحریکیں ردّعمل کی تحریکیں تھیں، نہ کہ حقیقی معنوں میں مثبت تحریکیں۔ جدید مسلم قیادت "مغرب" کے نام سے جس چیز سے واقف ہوئی وہ صرف یہ تھا کہ یہ ایک حملہ آور قوم ہے جو ہمارے لیے سیاسی چیلنج بن کر اٹھی ہے۔ وہ اس بات سے بے خبر رہے کہ مغرب دراصل کچھ جدید قوتوں کی دریافت کا نام ہے اور یہ قوتیں اسلام کے لیے عین مفید ہیں بلکہ بالواسطہ طور پر خود اسلامی انقلاب کی پیدا کردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسلم تحریکیں نئے امکانات سے فائدہ نہ اٹھاسکیں، وہ جدید قوموں کے مقابلے میں صرف ایک منفی رول ادا کر کے رہ گئیں۔

اس صورت حال کا مزید نقصان یہ ہوا کہ دوسری قوموں سے ہمارا صحیح اسلامی رشتہ قائم نہ ہوسکا۔ مسلمان کے لیے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر مذکورہ منفی نفسیات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہم نے ان قوموں کو مدعو نہ سمجھا، ان کو صرف حریف کی نظر سے دیکھا۔ اسلامی تحریکیں پیغامِ آخرت کی تحریکیں نہ رہیں بلکہ پیغامِ سیاست کی تحریکیں بن گئیں۔ ان تحریکوں نے انداز کے فرق کے ساتھ، جدید دنیا کو جس "اسلام" سے واقف کرایا وہ محض ایک قسم کا قومی اسلام تھا، نہ کہ خدا کا وہ دین جو انسانوں کو آخرت کی ابدی کامیابی کا راستہ دکھانے کے لیے آیا ہے۔ داعی اور مدعو کا تعلق حریف اور مدِّ مقابل کا تعلق بن کر رہ گیا۔

یہ مسلم تحریکیں اپنی جس معذوری کی وجہ سے "مغرب بحیثیت استعمار" اور "مغرب بحیثیت جدید قوت" کو الگ الگ کر کے نہ دیکھ سکیں، اسی معذوری کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ انھوں نے جدید قوموں کے خلاف اپنی مہم میں نہ تو نئی قوتیں فراہم کیں اور نہ نئے حالات کی رعایت کی۔ حد درجہ نادانی کے ساتھ سو سال سے بھی زیادہ عرصے تک جان و مال کی قربانیاں دی جاتی رہیں جبکہ ان قربانیوں کے لیے قطعی طور پر مقدر تھا کہ اسباب کی اس دنیا میں وہ بالکل رائگاں ہوکر رہ جائیں۔ اس طویل غیر حقیقت پسندانہ سیاست کی اب یہ نفسیاتی قیمت مسلمانوں کو دینی پڑ

رہی ہے کہ پوری کی پوری مسلم دنیا ایک قسم کے فرضی جنونِ عظمت (paranoia) کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور اب کوئی حقیقت پسندانہ بات اسے اپیل ہی نہیں کرتی۔

فخر نہیں ذمہ داری

پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے یکم اکتوبر 1980ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک تقریر کی۔ ان کی ڈیڑھ گھنٹہ کی یہ تقریر ان کے اپنے الفاظ میں دنیا بھر کے 90 کروڑ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے تھی۔ ان کی لکھی ہوئی تقریر کا ایک پیرا گراف یہ تھا:

"As they enter 15th Century Hijra, the Islamic peoples, who have rediscovered their pride in their religion, their great culture and their unique social and economic institutions, are confident that the advent of this century would mark the beginning of a new epoch, when their high ideals of peace, justice, equality of man, and their unique understanding of the universe, would once again enable them to make a worthy contribution to the betterment of mankind."

اب کہ اسلامی قومیں پندرھویں صدی ہجری میں داخل ہو رہی ہیں، انہوں نے اپنے مذہب، اپنے عظیم کلچر اور اپنے بے مثل سماجی اور معاشی اداروں میں اپنے فخر کو دوبارہ دریافت کر لیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ اس صدی کا آغاز ایک نئے عہد کی ابتدا ثابت ہوگا جب کہ امن، انصاف، انسانی برابری اور کائنات کے بارے میں ان کا بے مثل شعور ان کو دوبارہ اس قابل بنائے گا کہ وہ انسانیت کی بھلائی میں قابل قدر حصہ ادا کر سکیں۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے یہ بات موجودہ مسلمانوں کی تعریف کے طور پر کہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی میں مسلمانوں کا وہ المیہ بھی چھپا ہوا ہے جس نے موجودہ زمانے میں ان

کی تمام اسلامی کوششوں کو بے قیمت بنا دیا ہے۔ آج ساری مسلم دنیا میں اسلام کے نام پر زبردست سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر یہ ساری دھوم فخر (pride) کے طور پر ہے، نہ کہ ذمہ داری کے طور پر۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سرگرمی فخر کے احساس کی بنیاد پر اٹھتی ہے (الحدید، 57:20) اور اخروی سرگرمی عبدیت کے احساس کی بنیاد پر (الذاریات، 51:56) فخر سے انانیت اور مطالبے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اور عبدیت سے عجز اور ذمہ داری کا۔ اسلامی تحریک وہ ہے جو جہنم سے ڈرانے کے لیے اٹھے۔ مگر موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں دنیا میں بڑائی حاصل کرنے کے جذبہ سے اٹھی ہیں۔ قومی سربلندی کے احساس نے ان کو کھڑا کیا ہے۔ آج کے مسلمانوں کے لیے اسلام ایک نازکی چیز ہے، نہ کہ حقیقتاً آخرت کی صراط مستقیم۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ تحریکیں مسلمانوں کی قومی تحریکیں ہیں، نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی تحریکیں۔ مسلمانوں کے یہاں آج جس مذہب کی دھوم ہے وہ قومی مذہب ہے، نہ کہ خدائی مذہب۔ کیوں کہ قومی مذہب سے ہمیشہ فخر کی نفسیات ابھرتی ہے اور خدائی مذہب سے ذمہ داری کی نفسیات۔

حقیقی اسلام آدمی کے اندر عجز اور تواضع پیدا کرتا ہے اور جہاں عجز اور تواضع ہو وہاں گویا ساری بھلائیاں جمع ہوگئیں۔ کیوں کہ ہر خرابی کی جڑ کبر اور ہر اچھائی کی جڑ عجز ہے۔ ایسے افراد میں ان کے اسلام کے لازمی نتیجہ کے طور پر خدا کا خوف، آخرت کی طلب، باہمی اتحاد، ایک دوسرے کی خیر خواہی، شکایتوں سے درگزر کرنا، تعمیری کاموں کی طرف توجہ اور حقوق کے مقابلہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ اور جس سماج میں ایسی نفسیات والے انسان قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جائیں وہ اپنے آپ دنیا میں سب سے اونچا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس قومی اسلام آدمی کے اندر فخر و ناز کی نفسیات پیدا کرتا ہے اور جہاں فخر و ناز کے جذبات ہوں وہاں گویا تمام برائیاں جمع ہوگئیں۔ ایسے افراد کے اندر انانیت،

آخرت سے بے خوفی، اپنی غلطیوں کو دیکھنے کے بجائے دوسروں کا احتساب اور پھر ان کیفیات کے نتیجہ میں اختلاف اور باہمی ٹکراؤ عام ہوجاتا ہے۔ وہ خاموش تعمیری کام کے مقابلہ میں نمائشی کاموں کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ وہ پیچھے چلنے کے بجائے ہمیشہ آگے چلنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے معمولی کام کو بڑے بڑے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تاکہ اپنے برتری کے جذبہ کو تسکین دے سکیں۔ اسلام ایسے لوگوں کے درمیان کرنے سے زیادہ کہنے کی چیز ہوتا ہے۔ اور جہاں ایسا اسلام ہو وہاں لوگوں کے اوپر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے، نہ کہ خدا کی رحمت ونصرت۔

یہودیوں کی صہیونی تحریک قدیم اسرائیلی عظمت کو واپس لانے کی تحریک ہے۔ ہندوؤں کی آر ایس ایس تنظیم اپنے شان دار ماضی کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے اٹھی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی ایک پُرفخر دنیوی تاریخ ہے اور موجودہ زمانے کی مسلم تحریکیں کسی نہ کسی اعتبار سے اسی پُرفخر ماضی کو واپس لانے کے جذبے سے ابھری ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہودیوں اور ہندوؤں کی تحریکیں مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے کے باوجود حقیقی معنوں میں مذہبی تحریکیں نہیں ہیں، وہ یقینی طور پر صرف قومی تحریکیں ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی اسی قسم کے جذبات کے تحت اٹھنے والی تحریکیں بھی محض اس لیے اسلامی تحریکیں نہیں بن جائیں گی کہ وہ اپنے مقصد کو اسلامی الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔ خدا کسی کے عمل کو حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہے، نہ کہ ظاہر کے اعتبار سے۔ جو تحریک قومی نفسیات کے ساتھ اٹھے وہ خدا کی نظر میں قومی تحریک ہی رہے گی، اس کا قرآن وحدیث کے الفاظ استعمال کرنا کسی بھی طرح اس کو اسلامی تحریک کا مقام نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس پر خدا کے وہ وعدے پورے ہوسکتے جو صرف حقیقی اسلامی تحریک کے لیے مقدّر ہیں۔

کرنے کا کام

اسلام چونکہ آخری دین ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے وجود کے اعتبار سے قیامت تک باقی رہے۔ اسی لیے دین کا تحفظ بھی ایک ضروری اور مطلوب کام ہے۔ موجودہ زمانے کی بعض تحریکوں نے اس اعتبار سے یقیناً مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اسلام کے فکری اور عملی نقشہ کی محافظ ثابت ہوئی ہیں۔ بعض ادارے قرآن اور حدیث اور اسلامی مسائل کے علم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ بعض جماعتیں اسلامی عبادات کے ڈھانچے کو ایک نسل سے دوسری تک پہنچانے کا کام کر رہی ہیں۔ کچھ اور ادارے قرآن و حدیث کا متن صحت و صفائی کے ساتھ چھاپ کر ہر جگہ پھیلا رہے ہیں۔ یہ تمام کام بجائے خود مفید ہیں مگر بہر حال وہ تحفّظ دین کے کام ہیں، نہ کہ دعوتِ دین کے۔ جہاں تک اسلام کو دعوتی قوت کی حیثیت سے زندہ کرنے کا سوال ہے وہ موجودہ زمانے میں ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔ حتیٰ کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو شاید اس کا شعور بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر ایسے کاموں کو اسلامی دعوت کا عنوان دے دیتے ہیں جن کا اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

پندرھویں صدی ہجری میں کسی حقیقی اسلامی کام کے آغاز کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم اس صورت حال کو ختم کریں جس نے ساری دنیا میں اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک کے ہم معنی بنا رکھا ہے۔ مسلمان ہر ملک میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف شور و شر برپا کرنے میں مشغول ہیں۔ کہیں ان کی یہ تحریک غیر مسلم اقتدار کے خلاف برپا ہے اور کہیں مسلم اقتدار کے خلاف۔ کہیں وہ مسلح جدوجہد کے روپ میں ہے اور کہیں زبانی اور قلمی احتجاج کے روپ میں کہیں وہ ایک اسلامی سیاسی فلسفہ کے زیر سایہ کام کر رہی ہے اور کہیں فلسفہ اور نظریہ کے بغیر متحرک ہے۔ کہیں اس نے ملی عنوان اختیار کر رکھا ہے اور کہیں نظامی عنوان۔ تاہم سارے فرق و اختلاف کے باوجود نتیجہ سب کا ایک ہے۔ جدید امکانات کو دعوت توحید اور انذار

آخرت کے لیے استعمال نہ کرنا اور اپنی قوتوں کو بے فائدہ طور پر مفروضہ حریفوں کے خلاف محاذ آرائی میں ضائع کرتے رہنا۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بالکل الٹی کارکردگی کا ثبوت دیا ہے خدا نے دعوت حق کی راہ سے سیاسی رکاوٹ کو دور کر کے انھیں موقع دیا تھا کہ وہ آزادانہ حالات میں خدا کے تمام بندوں تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا کی اس اسکیم سے باخبر کر دیں جس کے تحت اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق وہ ایک ایک شخص کا حساب لینے والا ہے۔ مگر انھوں نے دوبارہ نئے نئے عنوان سے اپنے خلاف سیاسی رکاوٹیں کھڑی کر لیں۔ خود ساختہ سیاسی جہاد میں ہر ایک مشغول ہے مگر دعوتی جہاد میں اپنا حصہ ادا کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

قرآن میں ہے کہ اللہ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرے۔ (الحج، 22:40) ہر دور میں خدا اپنے دین کے حق میں کچھ امکانات کھولتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہوں جو خدا کے اشارے کو سمجھیں اور خدا کے منصوبے میں اپنے آپ کو شامل کر دیں۔ صحابہ کرام وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنھوں نے اپنے زمانے میں خدائی منصوبے کو سمجھا اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہ عظیم انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔

بارش کا آنا خدا کے ایک منصوبے کا خاموش اعلان ہے۔ یہ کہ آدمی اپنا بیج زمین میں ڈالے تا کہ خدا اپنے کائناتی انتظام کو اس کے موافق کر کے اس کے بیج کو ایک پوری فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ کسان اس خدائی اشارے کو فوراً سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو اس خدائی منصوبے میں پوری طرح شامل کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں اس کو واپس ملتا ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں، ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں، اللہ تعالی نے اپنے دین کے حق میں کچھ نئے مواقع کھولے تھے۔ یہ مواقع کہ اقتدار کا

حریف بنے بغیر توحید اور آخرت کی دعوت کو عام کیا جائے۔ جو کام پہلے معجزاتی سطح پر انجام دینا پڑتا تھا، اس کو عام طبیعیاتی استدلال کی سطح پر انجام دیا جائے۔ جو کام پہلے تعصب کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا اس کو مذہبی رواداری کے ماحول میں کیا جائے۔ جو کام پہلے ''حیوانی رفتار'' سے کیا جاتا تھا اس کو ''مشینی رفتار'' کے ساتھ انجام دیا جائے۔

یہ موجودہ زمانے میں خدا کا منصوبہ تھا۔ خدا نے سارے بہترین امکانات کھول دیے تھے اور اب صرف اس کی ضرورت تھی کہ خدا کے کچھ بندے ان کو استعمال کر کے ان امکانات کو واقعہ بننے کا موقع دیں۔ مگر مسلم قیادت خدا کے اس منصوبہ میں شامل ہونے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ اس نے نئے نئے عنوانات کے تحت وہی سیاسی جھگڑے دوبارہ چھیڑ دیے، جن کو خدا نے ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں ختم کیا تھا۔ انہوں نے اسلامی دعوت کو سیاسی اور قومی دعوت بنا کر دوبارہ اسلام کو اقتدار کا حریف بنا دیا اور کہا کہ یہی عین خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدعو قوموں کے ساتھ ہر جگہ بالکل بے فائدہ قسم کی مقابلہ آرائی شروع ہو گئی اور سارے نئے امکانات غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے رہ گئے۔

کام کی ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت مسلمانوں نے کھو دی۔ یہاں تک کہ شیطان نے بیدار ہو کر قدیم شرک کی جگہ جدید شرک (کمیونزم) کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ اب کمیونزم کے زیر تسلط علاقوں میں وقتی طور پر کام کرنے کی وہی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں جو اس سے پہلے شرک کے زیر تسلط علاقوں میں پائی جاتی تھیں۔ تاہم غیر کمیونسٹ دنیا میں اب بھی کام کے مواقع کھلے ہوئے ہیں اور یہاں پندرھویں صدی ہجری میں اس صالح جدوجہد کا آغاز کیا جا سکتا ہے جو چودھویں صدی ہجری میں نہ کیا جا سکا۔

—— نوٹ: یہ مقالہ اسلامی سیمینار (بھوپال) میں 18 جنوری 1981 کو پڑھا گیا۔

دعوت اور عمل

کوئی داعی اس وقت اللہ کی نظر میں داعی ہے جب کہ وہ داعی ہونے کے ساتھ عامل بھی ہو۔ آدمی جب کسی دوسرے شخص کو نیکی کی تلقین کرے تو سنجیدگی کا تقاضا ہے کہ وہ خود بھی اس پر کاربند ہو۔ حضرت شعیب نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ میں خود وہی کام کروں جس سے میں تم کو روک رہا ہوں۔ (ہود، 11:88)

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عمل، دعوت کی شرط ہے۔ دعوت وتبلیغ کا کام ہر حال میں جاری رکھا جائے گا خواہ داعی عامل ہو یا نہ ہو۔ مفسر ابن کثیر نے سورۃ البقرہ (آیت:44) کے تحت لکھا ہے:

”فَكُلٌّ مِنَ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَفِعْلِهِ وَاجِبٌ لَا يَسْقُطُ أَحَدُهُمَا بِتَرْكِ الْآخَرِ عَلَى أَصَحِّ قَوْلَيِ الْعُلَمَاءِ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ. وَذَهَبَ بَعْضُهُمْ إِلَى أَنَّ مُرْتَكِبَ الْمَعَاصِي لَا يَنْهَى غَيْرَهُ عَنْهَا وَهَذَا ضَعِيفٌ، وَأَضْعَفُ مِنْهُ تَمَسُّكُهُمْ بِهَذِهِ الْآيَةِ فَإِنَّهُ لَا حُجَّةَ لَهُمْ فِيهَا، وَالصَّحِيحُ: أَنَّ الْعَالِمَ يَأْمُرُ بِالْمَعْرُوفِ وَإِنْ لَمْ يَفْعَلْهُ، وَيَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ وَإِنِ ارْتَكَبَهُ، قَالَ مَالِكٌ عَنْ رَبِيعَةَ: سَمِعْتُ سعيد بن جبير يقول: لَوْ كَانَ الْمَرْءُ لَا يَأْمُرُ بِالْمَعْرُوفِ وَلَا يَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ حَتَّى لَا يَكُونَ فِيهِ شَيْءٌ مَا أَمَرَ أَحَدٌ بِمَعْرُوفٍ وَلَا نَهَى عن منكر. قال مَالِكٌ: وَصَدَقَ مَنْ ذَا الَّذِي لَيْسَ فِيهِ شيءٌ۔“ (تفسیر ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 85)

یعنی، ”پس معروف کی تلقین کرنا اور اس پر عمل کرنا دونوں ہی واجب ہیں، ان

یں سے کوئی ایک دوسرے کے ترک سے ساقط نہیں ہوتا۔ علماء سلف اور علماء خلف کا صحیح ترین قول یہی ہے۔ ان میں سے بعض اس طرف گئے ہیں کہ جو شخص گناہوں کا مرتکب ہو وہ دوسرے کو انہیں گناہوں سے نہ روکے۔ مگر یہ قول ضعیف ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ ضعیف بات یہ ہے کہ اس کو سورۃ البقرہ کی آیت: اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ۔ (2:44) سے نکالا جائے، کیوں کہ اس میں ان کے لیے کوئی دلیل نہیں۔"

"صحیح بات یہ ہے کہ عالم معروف کی تلقین کرے گا اگرچہ وہ اس پر عمل نہ کرتا ہو اور وہ منکر سے روکے گا اگرچہ وہ خود اس کا مرتکب ہو۔ مالک نے ربیعہ سے نقل کیا ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے سعید بن جبیر کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر ایسا ہوتا کہ آدمی صرف اس وقت معروف کی تلقین کرے اور منکر سے روکے جب کہ اس کے اندر کوئی چیز پائی نہ جارہی ہو تو کسی شخص نے بھی معروف کی تلقین نہ کی ہوتی اور نہ وہ منکر سے روکتا۔ امام مالک نے کہا اور سچ کہا کہ کون شخص ہے جس کے اندر کوئی چیز نہیں۔"

اس معاملے میں علماء اسلام کا اتفاق اس لیے ہے کہ یہ ایک اصول کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت کے لیے عمل کی شرط دعوت کو ہمیشہ کے لیے ناقابل عمل بنا دیتی ہے۔ کیوں کہ ایک سچا عامل اور صالح انسان اللہ سے ڈرنے والا انسان ہوتا ہے۔ ایسا آدمی آخرت کے احساس سے کانپتا رہتا ہے۔ اس کا احساس احتساب اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے بظاہر عمل کو بھی بے عمل سمجھنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں کون ہوگا جو اپنے صالح اور باعمل ہونے کا یقین کرے اور اس کے بعد وہ دعوت اسلامی کا آغاز کرے۔

اصل یہ ہے کہ دعوت احساس ذمہ داری کے تحت ظاہر ہونے والا عمل ہے، نہ کہ

احساس صالحیت کے تحت۔ مدعو بھی جب اپنے دین کو چھوڑ کر اسلام کو اختیار کرتا ہے تو وہ اسلام کی اپنی صداقت کی بنا پر ایسا اقدام کرتا ہے، نہ کہ مسلمانوں کو باعمل ہونے کو دیکھ کر۔ اگر داعی کے باعمل ہونے کو دیکھ کر لوگ حق کو قبول کرتے تو تمام انبیاء کے گرد انسانوں کی بھیڑ دکھائی دیتی۔ مگر معلوم ہے کہ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی بھی پیغمبر کے گرد انسانوں کی کوئی بڑی جماعت اکٹھا نہیں ہوئی۔ صحیح بات یہ ہے کہ دعوت ہر حال میں دینا ہے اور ہر شخص کو دینا ہے، اس کے لیے مذکورہ قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی جاسکتی۔

البیہقی اور ابن عساکر نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت حذیفہ نے ہم سے کہا کہ ہم اس علمِ دین کے حامل بنائے گئے تھے۔ اس کو ہم تمہیں دے رہے ہیں۔ اگرچہ ہم خود اس پر عمل نہ کر سکے: إِنَّا حَمَلْنَا هَذَا الْعِلْمَ وَإِنَّا نُؤَدِّيهُ إِلَيْكُمْ وَإِنْ كُنَّا لَا نَعْمَلُ بِهِ۔ (المدخل إلی السنن الکبری للبیہقی، اثر نمبر 839)

اصل رکاوٹ

کہا جاتا ہے کہ اسلامی دعوت کے حق میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے پاس اسلامی اعمال والے لوگ نہیں۔ عام انسان صرف مثال کے ذریعہ انقلابی تاثر قبول کرتا ہے، نہ کہ علمی بحثوں اور عقلی دلیلوں کے ذریعے۔ مگر ہماری بے بسی یہ ہے کہ ہم مدعو سے یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ — دیکھو یہ ہے اسلامی انسان، دیکھو یہ ہے اسلامی گھرانا، دیکھو یہ ہے اسلامی جماعت۔

یہ بات ظاہر نہایت درست معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ آدھی صداقت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس قول کی کوئی قیمت نہیں جس کے ساتھ عمل کی مطابقت شامل نہ ہو۔ اس اعتبار سے داعی کو بلاشبہ باعمل ہونا چاہیے۔ مگر یہ نہایت سادگی کی بات ہوگی کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ داعی اگر باعمل ہو تو تمام لوگ فوج در فوج

اس کے ساتھی بن جائیں گے۔

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام انبیاء اپنے عمل کے اعتبار سے معیاری انسان تھے۔ وہ بلاشبہ مثالی کردار کے حامل تھے۔ پھر کیا ان نبیوں کو دیکھ کر سارے لوگ جوق درجوق ان کے مومن بن گئے۔ قرآن بتاتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ تمام نبیوں کے مخاطبین نے ان کا انکار کر دیا۔ کردار وعمل کی تمام خوبیوں کے باوجود وہ ان کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ (یٰس، 36:30)

حقیقت یہ ہے کہ سچائی کو اختیار کرنے میں اصل رکاوٹ داعی کا عمل نہیں بلکہ مدعو کی مفاد پرستی ہے۔ داعی کی بات کو ماننے کے لیے لوگ اس لیے تیار نہیں ہوتے کہ اس کی بات ماننے سے لوگوں کی بڑائی ختم ہوتی ہے۔ ان کی اَنا کا بُت ٹوٹتا ہے۔ ان کے مفادات اور مصلحتوں کا تانا بانا منتشر ہوتا ہے۔ اپنی بنی بنائی زندگی کو توڑ کر ازسرِ نَو ایک نئے نقشے پر زندگی کی تعمیر کرنی پڑتی ہے۔ خاندانی روابط، سماجی تعلقات اور قومی بندھنوں کا سارا ڈھانچہ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ خود پرست ہیں، اس لیے وہ خدا پرست بننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور یہی حق کو ماننے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر ایسا ہوا کہ نسلِ انسانی کے سب سے بہتر اور مثالی افراد (انبیاء علیہم السلام) کا بھی لوگوں نے اعتراف نہیں کیا، بلکہ حقارت کے ساتھ ان کو نظر انداز کر دیا۔

اسلام میں زندگی کا جو تصور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس دنیا کے بنانے والے نے اس دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہمیشہ عسر کے ساتھ یُسر موجود رہتا ہے۔ ایک اعتبار سے اگر مشکل ہو تو دسرے اعتبار سے آسانی بھی یہاں ضرور پائی جائے گی۔ اسی کا نام اسلامی حکمت ہے۔ اسلامی حکمت عسر میں یسر کو دیکھتی ہے۔ اس کا تعلق ایک شخص کی ذاتی زندگی سے بھی ہے، اور پوری ملّت کی اجتماعی زندگی سے بھی۔ زیر نظر کتاب اسی اسلامی حکمت کو بیان کرتی ہے۔

ISLAMIC STUDIES
Goodword
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-93-5179-127-0
9 789351 791270
₹ 55